زہر کا دریا
رحیم گُل

پیش لفظ

لیجئے ------ "زہر کا دریا" پیش خدمت ہے۔
اس ناولٹ کو لکھنے میں صرف چند دن لگے۔
میں "جنت کی تلاش" لکھ کر فارغ ہو چکا تھا اور مسودے پر نظرثانی کر رہا تھا۔ ابھی یہ کام مکمل نہیں ہوا تھا۔ کہ مجھے اپنا ایک گم شدہ مسودہ ملا۔ جو کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک واقعہ سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ چنانچہ اسے دوبارہ لکھا۔ اور جیسا کہ خیال ہے "جنت کی تلاش" سے پہلے یہ آپ تک پہنچ جائے گا۔
"پیاس کا دریا" کے بعد "زہر کا دریا" -------- پتہ نہیں آپ اس میں سے کتنے گھونٹ بھر سکیں گے---------!؟
جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے "پیاس کا دریا" پی پی کر بھی ابھی تک پیاس نہیں بجھی۔ اور "زہر کا دریا" پی پی کر ابھی تک جیون کی جوت روشن ہے۔؟
حیرت ہے زندگی کی کتنی سخت جان ہوتی ہے۔ یہ موت سے ہار نہیں مانتی۔ کتنی صدیوں سے مقابلہ جاری ہے۔ موت وار کرتی ہے۔ زندگی وار بچاتی ہے۔ کوئی وار کارگر ہوتا ہے کوئی وار خالی جاتا ہے۔
مگر زندگی ہے کہ روز مجروح ہوتی ہے۔ اور دوسری صبح تازہ دم ہو کر

سامنے آجاتی ہے۔ اور موت کو للکارتی ہے۔
"میں کسی دن تمہیں زیر کروں گی۔ تم پر ضرور فتح حاصل کروں گی۔!"

"زہر کا دریا" کی کہانی یہی ہے۔ !!

رحیم گل

رحیم گُل کا ناولٹ ”زہر کا دریا“ پیشِ خدمت ہے۔

اِس ناولٹ کے ساتھ ہم نے رحیم گُل کے ۷ بہترین مگر غیر مطبوعہ افسانے بھی شامل کر دیئے ہیں۔ اِن افسانوں کی تلاش میں ہمیں بہت تگ و دَو اور محنت کرنا پڑی اور خاصا وقت صَرف ہوا، لیکن اِس اَمر کا اطمینان ہے کہ ہماری یہ محنت اکارت نہیں گئی اور ہم رحیم گُل کے اِن بہترین افسانوں کو گوشۂ گمنامی سے نِکال کر منظرِ عام پر لانے میں، کامیاب ہو گئے ہیں۔

نئے افسانے یہ ہیں:

- سائیں دُلاّ
- اندھی رُوح
- راجی
- بلندی اور پستی
- یہ کیفیتیں
- خاموش نگاہیں
- سُنہری جال

ہمیں اُمّید ہے کہ رحیم گُل کے یہ نئے افسانے آپ کو پسند آئیں گے۔

نوید اے شیخ

ناشر

فہرست

زہر کا دریا

یہ کہانی عدالت کے کٹہرے سے شروع ہوتی ہے اور عدالت کے کٹہرے میں ختم ہو جاتی ہے۔

عدیم جو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا' لگ بھگ اکیاون باون برس کا ہو چکا تھا۔

نوجوان جج امجد کرسیٔ عدالت پر بیٹھا فائل دیکھنے میں محو تھا۔ جج کے بائیں ہاتھ ریڈر اور دائیں ہاتھ ٹائپسٹ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ جج کے پشت کی دیوار پر قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی تصویر آویزاں تھی۔ مخالف سمت کی دیوار کے ساتھ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں' جن پر سامعین بیٹھے ہوئے تھے۔

عدالت کے کٹہرے اور سامعین کے درمیان چند وکلاء ایک گول میز کے ارد گرد بیٹھے جج کے احکام کا انتظار کر رہے تھے ...... ہلکی ہلکی سرگوشی کے باوجود عدالت میں ایک پروقار خاموشی کا سماں تھا۔

آخر جج نے اپنی روشن آنکھیں اٹھائیں ...... وہ خاصا قبول صورت نوجوان تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ سے عدالت کا جائزہ لیا۔ پھر اس کی نظریں ملزم عدیم کے متین چہرے پر ٹھہر گئیں ...... دو چار لمحے وہ ملزم کی غیر معمولی شخصیت کو ایسی نظروں سے دیکھتا رہا، جن میں ہمدردی، تذبذب اور شک کی ملی جلی کیفیت تھی۔ پھر اس نے کاروائی کا آغاز کیا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ملزم اقرار جرم کرتا ہے لیکن عدالت کو کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے اس لئے مشکل در پیش ہے کہ آج سے اٹھائیس برس پہلے ایک بار اس جرم کو خودکشی کہا گیا، دوسرے دن اعتراف جرم کر لیا گیا۔ عدالتی کاروائی بھی ہوئی تو پھر آج اس جرم کو تسلیم کرنے میں کیا مصلحت ہے۔ مقدمہ کی کاروائی کو مزید آگے بڑھانے سے پہلے عدالت اس بات کی تہہ تک پہنچنا بے حد ضروری سمجھتی ہے کہ سیٹھ داؤد کی موت کو خودکشی کیوں کہا گیا ......؟ اقبال جرم کیوں کیا گیا؟ سابقہ عدالت کی کاروائی کو کافی کیوں نہ سمجھا گیا۔ اور اب ملزم کس طرح کے انصاف کا متلاشی ہے؟"

ملزم عدیم نے تمکنت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"جناب والا، اگر میں جانتا کہ عدالت اس راز کے انکشاف کے لئے مجھے مجبور کرے گی تو شاید میں اقرار گناہ کی اس خواہش کا ہی گلا گھونٹ دیتا۔ میں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا، محض اپنے ضمیر کے تقاضے پر، اپنی روح سے انصاف کے لئے۔ میں نے جرم اس لئے قبول نہیں کیا تھا کہ اس راز سے پردہ اٹھا کر زندگی کی آبرو کو بے نقاب کر دوں گا؟"

جج نے اس سے کسی حد تک اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"ملزم کا عذر معقول سہی، اقرار گناہ کی جرأت ہی اپنی جگہ بہت بڑی بات ہے اور عدالت کو اس کا احترام ہے لیکن پھر بھی قانون کا تقاضا اس پر بھاری ہے۔ انصاف کو زندہ رکھنے کے لئے اگر زندگی کی آبرو پر آنچ آتی ہے تو آنے دو۔ چھوٹے

فرض کو بڑے فرض پر قربان کرنا پڑتا ہے" عدیم نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، یہ ٹھیک ہے جناب والا کہ چھوٹا فرض بڑے فرض پر قربان کر دیا جائے مگر...... مگر یہ فیصلہ کون کرے گا کہ ان میں چھوٹا فرض کونسا ہے اور بڑا فرض کونسا۔ زندگی میں کبھی کبھی اقبال جرم کی طرح ارتکاب جرم بھی فرض بن جاتا ہے۔ کون یہ تعین کرے گا کہ زندگی کی آبرو کے لئے مرنا بڑا فرض ہوتا یا مارنا بڑا فرض ہوتا ہے؟"

جج نے اس کی بات کاٹی۔

"تم عدالت کے پاس انصاف کی توقع لے کر آئے ہو تو تمہیں عدالت پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ عدالت کے پاس قانون کا معیار موجود ہے اگر حقائق سامنے آ جائیں تو قانون خود فیصلہ کر لے گا کہ ارتکاب جرم اور اخفائے جرم میں سے کونسا فرض بڑا ہے"۔

"اگر ان حقائق کے بغیر انصاف کی کاروائی ادھوری رہ جائے گی تو مجھے اس راز کے انکشاف میں کوئی عذر نہ ہو گا۔ جناب والا، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ میں عدالت کی بالا دستی کے بھروسے میں عدالت کے احترام کو مجروح کر دوں؟"

جج کسی قدر جوش اور یقین سے بولا۔

"عدالت کسی فرد کا نہیں، اس کرسی کا نام ہے ملزم، تم نے جو کچھ کہنا ہے بے دھڑک کہو۔ اگر عدالت سے تمہاری مراد اس کرسی پر بیٹھنے والے فرد سے ہے اور اس کا دامن آلودہ ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ کرسی اپنے اوپر بیٹھنے والے فرد کو اور ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہونے والے ملزموں کو ایک نگاہ سے دیکھتی ہے"۔

عدیم معذرت خواہ لہجے میں بولا۔

"خدا نہ کرے، میرا مطلب یہ ہو کہ میں محترم جج کی شان میں گستاخی

کروں۔ ملزم تو صرف ایک ہے جو کٹہرے میں کھڑا ہے اور اس کا نام عدیم ہے لیکن آج سے اٹھائیس برس پہلے کا کھلنڈرا عدیم' آج کے عدیم کی طرح خشک اور سنجیدہ نہیں تھا ...... جنابِ والا" اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا ...... "اس عدیم کے سینے میں ارمان تھے' ولولے تھے' تمنائیں تھیں۔ وہ عدیم کسی سے محبت کرتا تھا۔ اس عدیم سے بھی کوئی محبت کرتا تھا۔ اس عدیم کے سپنے رنگین اور اس عدیم کی صبحیں تازہ پھولوں سے آباد ہوا کرتی تھیں ...... جنابِ والا"۔

وہ اٹھائیس تیس برس پہلے کے واقعات جذباتی انداز میں بیان کرنے لگا۔

"میری عمر اس وقت بائیس تیئس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ سرتی کی عمر بھی انیس بیس سے زیادہ نہ ہو گی ...... وہ ہمارے مالی کی لڑکی تھی مگر انتہائی متین' حسین اور مطالعے کا ذوق رکھنے والی' چال ڈھال' وضع قطع اور رکھ رکھاؤ ایسا کہ شہزادیوں کا گمان ہو! مگر جو بات کہنی چاہیے وہ یہ کہ ہم ایک دوسرے سے والہانہ پیار کرتے تھے۔ وہ ایسی خوشبو تھی کہ میری سانسوں میں رچ بس گئی تھی ...... اس نے میری روح کو شاداب کر رکھا تھا ...... وہ روزانہ صبح پھولوں کا گلدستہ سجاتی اور خوشبو کی طرح میری آتما میں اتر جاتی ...... میں سویا رہتا۔ وہ آتی اور ہولے سے تازہ پھولوں کا گلدستہ میرے ہونٹوں سے لگا کر رکھ دیتی ...... میری روح میں گلاب کھل جاتے۔ میرے ہونٹوں پر مسکان کھیلتی۔ میں وجدانی طور پر اسے محسوس کرتا پھر متبسم آنکھوں سے اسے دیکھتا۔ بس یہی وہ لمحہ ہوتا تھا کہ ہم پر زندگی کے مفہوم کا انکشاف ہوا۔ میں اسے کہتا۔ پھول اور تم' صبح کی علامت ہو۔ آنکھ کھلے اور پھول نہ دیکھوں تو شاید ایسا لگے جیسے آج صبح نہیں ہوئی"۔

وہ عقیدت سے کہتی۔

"خدا نہ کرے' آپ کی صبح کبھی پھولوں کے بغیر آئے"۔

میں اٹھتا اس کی نورانی پیشانی چومتا اور اس سے کہتا۔ "سال کے تین سو

پینسٹھ دن گزر جاتے ہیں۔ پھولوں کی باس اور رنگ روپ بدل جاتا ہے مگر تمہاری ڈیوٹی میں ناغہ نہیں آتا"۔

وہ اسی عقیدت مندانہ لہجے میں کہتی۔

"مالی کی لڑکی ہوں۔ کم از کم پھولوں کے بیوپار میں تو پیچھے نہ رہوں گی"۔

اس کی من کو بھا جانے والی باتوں سے میری روح میں گدگدی ہوتی۔ "پھولوں کی آتما لے کر آئی ہو۔ جبھی دوسروں کے من کو گدگدا جاتی ہو"۔

وہ محبت کی فراوانی اور میرے لہجے کی سچائی پا کر کہتی۔

"ابا کہتے ہیں، مالن کی لڑکی ہوں اور پھول بیچنے سے واسطہ رکھوں ہمارا کام پھول اگانا ہے سجانا نہیں!"

میں ہنس کر پھولوں کا گلدستہ سینے سے لگا لیتا اور کہتا۔ "ابا سے کہنا' پھولوں کی باس من کا سندیسہ بن کر دوسروں تک پہنچ جائے تو میں کیا کروں"۔

وہ کسی دوسرے خوف کا دامن پکڑ کر بولتی۔ "ابا کہتے ہیں۔ غریب لوگ' امیر لوگوں سے من کی باتیں کریں تو ان کے خلوص پر ہمیشہ شبہ کیا جاتا ہے"۔

میں بے نیازی سے کہتا۔

"ابا سے کہنا امیر لوگ ضرور ایسا سوچتے ہوں گے مگر بڑے لوگ کبھی ایسا نہیں سوچتے"۔

وہ پھر سے دبے لہجے میں شک کا اظہار کرتی۔

"وہ کہتے ہیں' مالی کی لڑکی رانی بننے کے خواب دیکھے گی تو وہ رانی تھوڑی بن جائے گی؟"

میں ٹہلنے لگ جاتا۔

"تمہارے ابا شاید یہ نہیں جانتے کہ خواب ہمیشہ پورے ہونے کے لئے آیا کرتے ہیں۔ جو آدمی جس طرح کا سوچتا ہے' اسی طرح کا بن جاتا ہے"۔ میرے لہجے میں یقین کی روشنی پا کر وہ گڑبڑا جاتی۔

"ابا کی باتیں دماغ میں جا بیٹھتی ہیں۔ آپ کی باتیں دل میں گھر بسا لیتی ہیں۔ ان کے کہے سے سینے کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ آپ کے کہے سے من کی لگی اور تیز ہو جاتی ہے"۔

میں اس کی طرف پلٹتا۔

"پڑھنے لکھنے کے باوجود تم اتنی بات بھی نہیں جانتیں کہ دونوں میں ٹھیک بات کون کہتا ہے؟"

وہ سٹپٹا کر کہتی ......

"یہی تو مشکل ہے' جس شخص کا خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے' وہ میرے معاملے میں غلط نہیں کہہ سکتا اور جس شخص کی آنکھوں میں میرے لئے پیار ہی پیار چھلکتا ہے وہ بھی میرے بارے میں غلط نہیں کہہ سکتا۔ ایسے میں کوئی فیصلہ کروں تو کیا کروں۔ آپ ہی بتایئے کیا کروں؟"

میں ہنس کر اسے تسلی دیتا ......

"تمہارے ابا جو کہتے ہیں' شک کی بناء پر کہتے ہیں' میری طرح یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں' دوسروں کے حوالے سے کہتے ہیں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں' میرے دل کی آواز ہوتی ہے۔ اس فاصلے کو تمہارے ابا نہیں سمجھیں گے سرتی' تم خود سمجھو گی"۔

وہ اقرار کرتی ......

"میں جانتی ہوں' آپ مجھے دھوکہ نہیں دیں گے لیکن میں سہمی ہوئی رہتی ہوں' ڈری ہوئی رہتی ہوں۔ آپ کوئی ایسا طریقہ بتا دیجئے کہ میرے دل سے ہر قسم کا خوف نکل جائے ...... مجھے یقین آ جائے کہ میں وہی لڑکی ہوں' جسے میں نے تصور میں دیکھا ہے"۔

میں قریب جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر کہتا ......

"تم کو بہت جلد یقین آ جائے گا سرتی کہ تم نے جو خواب دیکھے تھے سچے تھے۔ میں بہت جلد تمہارے ابا اور اپنے ڈیڈی سے بات کر کے تمہیں اپنے خوابوں کی تعبیر بنا لوں گا۔ میں بہت جلد تمہیں دلہن بنا کر لاؤں گا سرتی!"

تب اس کی آنکھوں میں جگنو دمکنے لگتے۔ فرطِ حیاء اور حجاب سے اس کی نگاہیں جھک جاتیں اور نہایت سادگی سے میرے شانے پر سر رکھ دیتی۔ ہم ہر صبح ایک نئی صبح سے ہمکنار ہوتے۔

ہر شام تازہ گلوں کے مخمور جھونکے نئے سندیسے لاتے۔ ہر دن نئی مسرتوں کے جام کھنکتے اور ہماری روحوں کو گداز کر جاتے۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ سرتی نہ آئی اور نہ تازہ پھول سجے۔

باسی پھولوں کا گلدان تپائی سے گر پڑا۔ مالی بابا چائے کی ٹرے کے لئے جگہ بنا رہا تھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ سرتی کی جگہ مالی بابا کو دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"تم! بابا تم!!" میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "آٹھ بج گئے ہیں؟"

مالی بابا دھیمے لہجے میں بولا۔

"ہاں بیٹا' آج آپ کی آنکھ وقت پر نہیں کھلی' چائے بھی وقت پر نہیں ملی۔ سوچا دے آؤں"۔

"مگر کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "سرتی کہاں ہے؟ اس نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟ گلدان میں رات کے باسی پھول اسی طرح پڑے ہیں' وہ تازہ پھول بھی نہیں لائی؟"

مالی بابا دکھے دل سے بولا۔

"اتنے ڈھیر سارے سوالوں کا میں تو ایک ہی جواب دے سکتا ہوں بیٹے کہ

جب لوگ کلیاں ہی توڑ ڈالیں تو تازہ پھول کہاں سے کھلیں گے!"

میری حیرت اور بڑھ گئی۔

"کیا کہتے ہو بابا' سرتل کی صبح کبھی تازہ پھولوں کے بغیر نہیں آئی"۔

مگر مالی بابا کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

"زندگی سدا ایک سی تھوڑی رہتی ہے بیٹا۔ کبھی بہار کبھی خزاں!"

میں اس کے لہجے سے جھنجلا اٹھا۔

"کیا الجھی الجھی باتیں کرتے ہو بابا' بات کیا ہے آخر؟"

"بات بہت بڑی ہے بیٹا"۔ وہ رک رک کر بولا۔ "مگر بتانے والی زبان بہت چھوٹی ہے شاید زمانہ اعتبار نہ کرے!"

اب مجھے خطرے کا احساس ہو چلا تھا۔ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر نرمی سے پوچھا۔

"کہہ دو بابا' کہہ دو جو کہنا چاہتے ہو؟"

مالی بابا کی آواز گمبھیر ہو گئی۔

"تیس برس سے اس گھر کی خدمت کر رہا ہوں آج اس کا صلہ مل گیا ہے!"

"کہنا کیا چاہتے ہو مالی بابا؟" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"غصہ آگیا عدیم بیٹے کو!" مالی بابا کے لہجے میں طنز تھا۔ "امیری غریبی میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔ ذرا سی بات سننے میں دیر ہو گئی تو پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ میری زندگی بھر کی کمائی لٹ گئی مگر زبان فریاد کرنے کی ہمت نہیں رکھتی!"

"بابا میں التجا کرتا ہوں۔" میں ایک دم نرم پڑ گیا۔ "جو کہنا چاہتے ہو' جلدی سے کہو۔ میرا پیمانۂ صبر واقعی لبریز ہو گیا ہے"۔

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"آپ کی بے چینی بجا ہے بیٹا مگر سچ تو یہ ہے کہ میں بتاؤں کیونکر' ایک باپ کی زبان پر چھالے نہ پڑ جائیں گے۔ آخر وہ کس طرح کہے کہ اس کی عزت کوڑیوں کے مول بک گئی ہے!"

"سرتل کہاں ہے بابا؟" میں نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔

"اپنی کوٹھڑی میں سسک رہی ہے"۔ مالی بابا کی آواز بالکل خالی خالی تھی۔

"رات بھر روتی رہی ہے۔ ہزار سمجھایا مانتی ہی نہیں لیکن آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے پی لیجئے۔ خود تھک ہار کر خاموش ہو جائے گی!"

"رہنے دو بابا' رہنے دو"۔ میں پاگلوں کی طرح اٹھا اور باہر نکل گیا۔

جب میں سرتل کے کمرے میں پہنچا تو وہ کھاٹ پر اوندھے منہ پڑی رو رہی تھی۔ میں چند لمحے خاموش کھڑا اس کے خوبصورت شانوں کو دیکھتا رہا۔ پھر چپکے سے اس کے قریب بیٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"سرتل! سرتل!!" میں نے اسے ہلایا۔ "بتاؤ کیا بات ہو گئی ہے؟"

"کچھ نہیں عدیم صاحب' کچھ نہیں"۔ اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"کچھ کیسے نہیں"۔ میں نے اس کی خالی باہوں کی طرف دیکھا۔ "تمہاری چوڑیاں ٹوٹ گئی ہیں، تمہاری باہیں خالی ہیں۔ تم آج پھول بھی نہیں لائیں۔ بتاؤ کس نے توڑی ہیں یہ چوڑیاں؟"

"کسی نے بھی توڑی ہیں"۔ وہ جیسے بات ختم کرتے ہوئے بولی۔ "ٹوٹنے کی چیز تھی ٹوٹ گئیں۔ سنگ تو نہیں تھا نا' شیشہ تھا' ٹوٹ گیا!"

میں نے جواب طلبی کے انداز میں پوچھا۔

"لیکن اگر یہ شیشہ تھا تو کیا اتنا قیمتی تھا کہ تم نے اس کے غم میں میری صبح کو پھولوں سے محروم کر دیا ہے؟"

وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔

"نہیں نہیں' یہ اتنا قیمتی نہیں تھا۔ مجھ سے بھول ہو گئی عدیم صاحب' مجھ سے بھول ہوگئی۔ میں کل سے پھول لایا کروں گی۔ میں اس گھر کی خادمہ ہوں' میں اپنی حیثیت نہیں بھول سکتی تو پھول کیسے بھول سکتی ہوں۔ میں آپ کی صبح ویران نہیں ہونے دوں گی!"

"سرتل ......!" میں احتجاج کرتے ہوئے چیخا۔

وہ اسی موڈ میں بولی۔

" مجھ سے چوک ہو گئی' مجھے معاف کر دو عدیم صاحب ، میں آئندہ اپنی ڈیوٹی میں کبھی ناغہ نہیں کروں گی"۔

میں نے دوبارہ احتجاج کیا۔

"سرتل' میرے خلوص کا مذاق اڑاتی ہو۔ یہ صبحیں میری اکیلی نہیں' تمہاری بھی تھیں بلکہ ان کی خالق ہی تم ہو ...... میں پوچھنے آیا ہوں' آج وہ خوشی کہاں کھو گئی' جس کے لئے تم نے جاڑوں کی لاتعداد گرم گرم نیندیں قربان کر دی تھیں؟"

"عدیم صاحب"۔ اس کے لب و لہجے میں غصے اور بے بسی کا انداز بالکل نمایاں تھا ...... "اگر اس خوشی کی خالق کو آج کے لئے آپ معاف کر سکتے ہیں تو کل سے یہ سب کچھ دوبارہ ہو گا ...... مگر یہ آج ...... یہ آج پھر لوٹ کر نہیں آئے گا' کبھی واپس نہیں آئے گا ...... یہ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں دوبارہ جڑ کر کبھی میری کلائیوں میں نہ سجیں گی۔ گرے ہوئے آنسو کے لئے تو اس آنکھ میں بھی جگہ نہیں رہتی' جس سے وہ گرا ہو"۔

میں اس کے لفظوں کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔

"بے شک سرتل' گرا ہوا آنسو واپس آنکھ میں نہیں آ سکتا مگر گرانے والے کی آنکھ ضرور پھوڑی جا سکتی ہے۔ بے شک ٹوٹی ہوئی چوڑی دوبارہ نہیں جڑ سکتی

لیکن توڑنے والے کا ہاتھ ضرور توڑا جا سکتا ہے۔ تم بتا دو سرتل' جس شخص نے تمہاری خوشیاں چھینی ہیں مَیں اس کے دامن میں ایک خوشی بھی نہیں چھوڑوں گا!"

"نہیں نہیں"۔ اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ "یہ گھر میرے لئے تباہ نہیں ہو سکتا۔ یہ گھر میرے لئے تباہ نہیں ہو گا عدیم صاحب"۔

میں نے بے حد ٹھہرے ہوئے مگر پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"اگر تمہاری تباہی کا راز اس گھر سے تعلق رکھتا ہے تو اس گھر کا تباہ ہونا مقدر ہو چکا ہے سرتل"۔

"نہیں نہیں"۔ وہ اور زیادہ گھبرا گئی ...... "میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھے کسی بات کے لیے مجبور نہ کریں۔ نہیں' میری زبان نہیں کھل سکتی۔ ہاں ہاں' میں کیسے بتا سکتی ہوں' کیسے بتا سکتی ہوں!"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں جان گیا تھا کہ سرتل پر کیا افتاد پڑی ہے۔

"میں جان گیا ہوں سرتل کہ جو نام تمہارے بابا اور تمہاری زبان پر نہیں آیا' کتنا بڑا نام ہو گا...... لیکن سرتل' تمہاری عصمت کی قسم' میں اس شخص کا خون پی جاؤں گا' جس نے ایک بے آسرا لڑکی کے کنوارے رخساروں کی سرخی چھینی ہے!"

میں تیزی سے اس کے کمرے سے نکل گیا۔ وہ چیختی رہی ، مجھے آوازیں دیتی رہی۔ "عدیم صاحب رکیے ...... رک جائیے عدیم صاحب' رک جائیے!"

اس کی آواز میرے قدموں کے نیچے سسکتی رہی مگر مجھے کوئی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں مَیں اس شخص کے پاس پہنچ گیا' جس کا نام مالی بابا اور سرتل کی زبان پر نہیں آ رہا تھا......

ڈیڈی اس وقت بھی شراب کے نشے میں تھے کیونکہ وہسکی کا بھرا ہُوا گلاس اور بوتل تپائی پر پڑی تھی ...... میری آنکھوں میں خون اور ہاتھ میں پستول دیکھ کر ان کا نشہ ہرن ہو گیا تھا مگر ابھی وہ صفائی بھی پیش نہ کر پائے تھے کہ میں نے متعدد گولیاں

چلا کر انہیں ڈھیر کر دیا ......

چند لمحے کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ جب ان کی لاش ٹھنڈی ہو گئی تو ٹیلی فون کا چونگا اٹھا کر پولیس کا نمبر ملایا لیکن ابھی میں صرف ہیلو ہی کر پایا تھا کہ سرتل تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے ریسیور میرے ہاتھ سے چھین لیا۔

میں نے احتجاج کیا تو وہ ریسیور پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"آپ خدا کے لئے خاموش رہیئے"۔

میں ہکا بکا کھڑا رہا۔ اس نے ریسیور سے ہاتھ اٹھا کر پولیس سٹیشن سے بات کی اور دوسرے لمحے اس نے ڈیڈی کے قتل کو خود کشی کہہ کر پولیس کو جلد پہنچنے کی تاکید کی۔

جب اس نے چونگا رکھ دیا تو مَیں احتجاجاً" بولا۔

"یہ تم نے کیا کر دیا سرتل......؟"

"یہی مناسب تھا"۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا...... "یہی ٹھیک تھا عدیم صاحب"۔

"مگر تم نے پولیس کو غلط رپورٹ دے کر اچھا نہیں کیا۔ میں اقبالِ جرم کروں گا"۔

"ہرگز نہیں!" وہ دعوے سے بولی۔ "یہ نہیں ہوگا"۔

"کیوں نہیں ہو گا"۔ میں نے اصرار کیا۔ "میں ہر قیمت پر عدالت کا سامنا کروں گا"۔

"نہیں بالکل نہیں"۔ وہ اسی لہجے میں بولی۔ "مجھ منحوس کے لئے سارا گھر تباہ نہیں ہو سکتا"۔

"یہ تباہی نہیں سرتل میں سارے زمانے کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ انسان مر جائے تو کچھ نہیں مرتا ۔ لیکن انسان کی آبرو لٹ جائے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے"۔

"نہیں نہیں!" اس نے زور دے کر میری تردید کی"۔ کائنات اِدھر سے ادھر ہو جائے' میں آپ پر آنچ نہیں آنے دوں گی"۔

"مگر اس طرح تم مجھے سچائی کے راستے سے ہٹا رہی ہو سرتل' میں زندگی کی قدروں کے لئے جینے مرنے کو زندگی سمجھتا ہوں' اسی کو میں نے سچائی کا نام دے رکھا ہے اور اسی کے خاطر میں انصاف کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا"۔

"نہیں بالکل نہیں!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "اگر آپ نے اقبال جرم کر لیا تو میں ساری ذمہ داری اپنے سر لے لوں گی۔ میں کہوں گی' عصمت میری لٹی ہے' خون میں نے کیا ہے' سزا مجھے ملنی چاہیئے!"

"سرتل ......!" میں تقریباً" چیخا ......

لیکن اتنے میں پولیس پہنچ گئی۔ باہر ان کی جیپ کے رکنے کی آواز آگئی تھی۔

سرتل میرے قریب آگئی۔ اس نے دبے ہوئے مگر پُریقین لہجے میں کہا ......

"اگر آپ نے میرا کہا نہ مانا تو یقین جانیئے' میں خود کشی کر لوں گی!" میں احمقوں کی طرح اس کے منہ کو دیکھتا رہ گیا' پولیس اندر آگئی۔ پستول ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ تھانیدار نے لاش کو دیکھا۔ شراب کی بوتل اور گلاس کا معائنہ کیا۔ کمرے کی دوسری چیزوں کا جائزہ لیا اور پھر اچانک میری طرف متوجہ ہوا۔

"آپ کا سیٹھ داؤد سے کیا تعلق ہے؟"

"جی میں ان کا لڑکا ہوں۔ میرا نام عدیم ہے"۔

"اوہ ...... آئی سی!" تھانیدار نے طنزیہ لہجے میں کہا ...... "یہ تو بتایئے عدیم صاحب جس وقت گولی چلی تھی آپ کہاں تھے؟"

یہی وہ موقع تھا کہ مجھے سچ اور جھوٹ دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا کہ عین اس لمحے سرتل نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا اور میں گڑ بڑا گیا ...... اور

میں نے تھانیدار سے جھوٹ کہہ دیا۔

"جی میں اپنے کمرے میں چائے پی رہا تھا' فائر کی آواز سن کر ادھر آیا"۔

سرتل کی آنکھوں میں اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"آپ کے آنے سے پہلے کمرے میں کسی کی موجودگی کا شبہ کیا جا سکتا ہے؟"

"جی نہیں' سب سے پہلے میں پہنچا' اس کے بعد سرتل آگئی"۔

"آپ دونوں کے علاوہ اور یہاں کون رہتا ہے؟"

"جی ہمارا مالی' سرتل کے ابا اور دوسرے نوکر چاکر"۔

"آپ کسی پر شبہ کرتے ہیں؟"

"جی نہیں' سب پرانے ملازم ہیں اور قابلِ اعتماد"۔

"جس وقت آپ یہاں پہنچے۔ پستول کہاں پڑا تھا؟"

"جی فرش پر' میں نے اسے اٹھا لیا"۔

تھانیدار کچھ سوچنے لگ گیا۔ پھر معاً میری طرف پلٹا۔

"تو آپ کو یقین ہے کہ سیٹھ صاحب نے خودکشی کی ہے؟"

"جی ہاں ...... میرا خیال یہی ہے"۔

"ٹھیک ہے مگر یہ تو بتایئے عدیم صاحب' کیا سیٹھ روزانہ شراب پیتے تھے؟"

"جی نہیں' آج سے پانچ چھ برس پہلے روزانہ پیتے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر کے کہنے پر ترک کر دی۔ آج اتنے عرصے بعد پہلی مرتبہ ان کے کمرے میں شراب پائی گئی"۔

"اس کی وجہ ......؟" تھانیدار نے میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔

"بظاہر اس کے کہ چند مہینوں سے کاروبار میں مسلسل گھاٹا پڑ رہا تھا اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی"۔

"تو آپ کا خیال ہے' وہ نقصان کے غم کو شراب کے نشے میں بھول جانا چاہتے تھے؟"

"ہو سکتا ہے"۔ میں نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"آپ ان کے اکلوتے لڑکے ہیں؟"

"جی ہاں' میری پیدائش پر میری ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ڈیڈی نے دوسری شادی کرنا پسند نہ کیا"۔

"ایک بات بتایئے"۔ اس نے پہلے سرتل کو اور پھر میری طرف دیکھا۔

"جب میں نے ریسیور اٹھایا تھا تو مرد کی آواز سنائی دی تھی۔ پھر فوراً لڑکی بولنے لگ گئی۔ اس پر آپ روشنی ڈالیں گے؟"

میں اس سوال سے چکرا گیا لیکن سرتل نے فوراً صورتِ حال کو سنبھال لیا۔

"بات یہ تھی تھانیدار صاحب کہ اچانک باپ کی لاش دیکھ کر عدیم صاحب بہت گھبرا گئے تھے۔ میں نے دیکھا یہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان سے بات نہیں ہو رہی تھی چنانچہ میں نے ان کے ہاتھ سے فون لے کر آپ کو اطلاع دی"۔

"آئی سی"۔ تھانیدار مشکوک لہجے میں بولا۔ "اچھا مسٹر عدیم' ہمیں سیٹھ صاحب کی اچانک موت کا افسوس ہے۔ فی الحال ہم لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجتے ہیں' مزید تفتیش میں آپ کی ضرورت پڑی تو آپ کو زحمت دی جائے گی"۔

"میں ہر وقت حاضر ہوں تھانیدار صاحب"۔

پولیس چلی گئی۔ میں نے سرتل کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے جذبات تھے۔ یوں میں اپنا دکھ بھول گیا۔

لیکن اگلی صبح بیدار ہوا تو تپائی پر باسی پھولوں کا گلدستہ میرا منہ چڑا رہا تھا۔ میں نے مالی بابا اور سرتل کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ راتوں رات گھر چھوڑ چکے ہیں۔ مجھے شدید صدمہ ہوا ...... جس لڑکی کے کہنے پر میں نے پولیس کے سامنے

جھوٹ بولا۔ باپ کی موت کو خودکشی کہا' وہی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔

کس طرح کے جذباتی دباؤ کے تحت اس نے یہ فیصلہ کیا ہو گا اور کیا سوچ کر اس نے مجھے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس کا یہ فیصلہ جہاں جذباتی طور پر میرے لئے تکلیف دہ تھا' وہاں اس نقطۂ نگاہ سے مجھے آزادی مل گئی تھی کہ میں ضمیر کی آواز پر لبیک کہوں ' عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔ چنانچہ اسی دن میں پولیس سٹیشن پہنچ گیا۔

تھانیدار نے مجھے دیکھ کر خوش آمدید کہا اور بتایا۔

ابھی ابھی آپ کے والد صاحب کی پوسٹ مارٹم رپورٹ موصول ہوئی ہے۔

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"غالباً" رپورٹ میں کہا گیا ہو گا کہ سیٹھ صاحب نے خودکشی نہیں کی بلکہ قتل ہوئے ہیں"۔

"ہاں ٹھیک ہے"۔ تھانیدار نے میری تائید کی۔ "ڈاکٹری رپورٹ یہی کہتی ہے اور ہم اس رپورٹ کی بنیاد پر تفتیش کا رخ بدل رہے ہیں لیکن آپ کو اس کی اطلاع کیسے ہوئی؟"

"اس لئے کہ وہ واقعی قتل ہوئے ہیں اور مجرم اقبالِ جرم کرنے خود حاضر ہوا ہے"!

تھانیدار نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"آپ ...... عدیم صاحب آپ!"

"جی ہاں' ڈیڈی کو میں نے قتل کیا ہے"۔ میں نے اطمینان سے کہا۔

"لیکن کل آپ نے اس کا اقرار نہیں کیا"۔

"مجبوری تھی۔ میرے ساتھ جو لڑکی تھی' وہ جرم اپنے سر لینا چاہتی تھی"۔

"اور اب؟"۔

"اب وہ مجبوری نہیں رہی۔ لڑکی اور اس کا باپ دونوں چلے گئے ہیں"۔

"مگر کیوں؟" تھانیدار نے مزید حیرت کا اظہار کیا۔ "وہ لڑکی اتنا بڑا جرم اپنے سر کیوں لینا چاہتی تھی ......؟"

"مجھے بچانے کی خاطر"۔

"آپ کو وہ کیوں بچانا چاہتی تھی؟"

"اس لئے کہ یہ قتل اُس کی وجہ سے ہوا تھا"۔

"عدیم صاحب' مہربانی ہو گی اگر آپ یہ سب باتیں وضاحت سے بتائیں"۔

"میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ سرتی ہمارے مالی کی لڑکی ہے' جس سے میں پیار کرتا ہوں بلکہ شادی بھی کرنا چاہتا تھا لیکن بد قسمتی کہ اس رات اچانک ڈیڈی نے اس کی عزت لوٹ لی۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا اور میں نے ڈیڈی کو قتل کر دیا!"

"اوہ ...... ! تو یہ ہے صورت حال' اگرچہ ایک پولیس افسر کی حیثیت سے قتل کا معمہ حل ہونے پر مجھے خوشی ہوئی لیکن ایک بات میں آپ سے مصلحتاً پوچھوں گا۔ اگر آپ چاہتے جیسا کہ پہلے دن ہوا تھا' آپ اس قتل پر پردہ ڈال سکتے تھے تو آپ نے خود کو بچانے کی بجائے قانون کے حوالے کرنے میں کیا مصلحت سمجھی ...... ؟"

"یہ مصلحت نہیں میرا فرض تھا تھانیدار صاحب' اس فرض کی طرح جس نے مجھے قتل پر آمادہ کیا۔ میں عادی مجرم نہیں ہوں کہ جرم سے پہلے اپنے بچاؤ کی تدابیر پر غور کرتا ...... لڑکی کی عصمت لٹی۔ میں نے باپ کو قتل کر کے اس کی تلافی کی اور اب اس کی پاداش میں خود کو قانون کے حوالے کر رہا ہوں۔ یہ تمام کام میں نے فرض سمجھ کر انجام دیئے ہیں"۔

"میں آپ پر شک نہیں کرتا اور نہ آپ کے رویے کی داد دوں گا۔ امید ہے قانون بہتر نتیجے پر پہنچ سکے گا مگر اس مقدمے میں اس لڑکی کی شہادت بہت ضروری ہے۔ آپ اس سلسلے میں ہماری کیا مدد کریں گے؟"

"میرا خیال ہے۔ وہ آپ کو نہیں ملے گی کیونکہ وہ مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہے۔ اس نے میرا نفسیاتی بوجھ کم کرنے کے لئے میرا گھر چھوڑا ہے۔ اور بالفرض آپ نے اسے تلاش کر بھی لیا تو وہ میرے خلاف شہادت کب دے گی۔ وہ تو الٹا جرم اپنے سر تھوپ لے گی اور ناکردہ گناہی کا عذاب مول لے لے گی ...... تھانیدار صاحب' اس پہلو پر نظر رکھیئے' کہیں آپ کا مقدمہ خراب نہ ہو جائے اور میں جو اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر نکلا ہوں' دوہرے عذاب کے شکنجے میں جکڑ نہ لیا جاؤں؟"

"ٹھیک ہے"۔ تھانیدار سوچ میں پڑ گیا۔

اور یوں میں ضمیر کے تقاضے اور دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے عدالت میں پہنچ گیا ...... سیشن جج جس کی عمر چالیس بیالیس کے لگ بھگ تھی' اس مقدمے میں خصوصی دلچسپی لیتا رہا۔ وہ اگرچہ میرے ڈیڈی کے دوستوں میں سے نہیں تھا مگر ان کے جاننے والوں میں سے ضرور تھا۔

سرکاری وکیل نے واقعات پر جرح کرتے ہوئے کہا۔

"جنابِ والا' مقدمے کی ساری کاروائی سے صاف عیاں ہے کہ یہ نہ تو حفاظت خود اختیاری کا کیس بنتا ہے اور نہ اشتعال کی تعریف میں آتا ہے۔ اس میں کسی شہادت کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ ملزم خود اقرارِ جرم کرتا ہے۔ یہ مقدمہ صاف قتل عمد کی تعریف میں آتا ہے!"

ہرگز نہیں جنابِ والا"۔ وکیل صفائی نے اس کی بات رد کی۔ "جن حالات میں قتل ہوا ہے' عدالت کو اس پر غور کرنا ہوگا ...... ایک بے بس کنواری لڑکی کی عزت لٹ گئی۔ ایک ایسی چیز لٹ گئی جو کبھی واپس نہیں آتی۔ ہیرے جواہرات چوری ہو جاتے ہیں۔ دکانیں اور بنک لوٹ لئے جاتے ہیں لیکن ان سب چیزوں کی واپسی کا امکان ہوتا ہے ...... سرسراتے نوٹوں کی جگہ نئے نوٹ چھپ کر آ سکتے ہیں۔ چمکتے دمکتے بے جان ہیرے کی جگہ دوسرا ہیرا خریدا جا سکتا ہے لیکن روئے زمین پر عورت

کی عصمت ہی ایک ایسی چیز ہے جو ایک بار لٹ جائے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لٹ جاتی ہے ...... جنابِ والا ایک ایسا شخص جو فطرتاً" نیک اور شریف النفس ہو' اتنا بڑا حادثہ ہونے کے بعد قدرتی طور پر اشتعال میں آئے گا اور نتیجتاً وہ قتل بھی کر سکتا ہے۔ غور کرنے والی بات یہ ہے جنابِ والا کہ قتل کسی غیر کا نہیں اپنے باپ کا کرتا ہے۔ یہ انتقام نہیں' سچائی کی طرف بڑھنے والا عمل ہے۔ جنابِ والا ...... اس مقدمہ میں قانون کو اس نیک جذبے کا سراغ لگانا ہوگا جو اس قتل کا محرک بنی۔!"

مگر سرکاری وکیل نے ان دلائل سے اتفاق نہ کیا اور جج سے کہا۔ "جنابِ والا ...... قانون ذاتی امنگوں اور جذباتی اتار چڑھاؤ کا نام نہیں ہے۔ عصمت دری کے جرم کے لئے ملک کا قانون موجود ہے ...... اگر کسی کی عزت لٹتی ہے' کوئی زبردستی کرتا ہے تو قانون کا دروازہ کھلا ہے۔ قانون کی کتابوں میں اس جرم کی سنگین سزا موجود ہے۔ جب داد رسی کے لئے اتنے موقع موجود ہیں تو یہ کونسی ادا ہے کہ ملک کے رائج الوقت قانون کا احترام ختم کر دیا جائے اور پستول ہاتھ میں لے کر دوسرے کا سینہ چھلنی کر دیا جائے ...... اور پھر بڑے طمطراق سے سچائی کا علم لے کر عدالت کے کٹہرے میں پہنچ جائے اور انصاف کا تقاضا کرے بلکہ اصرار کرے کہ ہمارے اقدام کو حق بجانب قرار دیا جائے ......

"جنابِ والا ...... یہی نہیں بلکہ ملزم ابھی تک یہ ثابت نہیں کر سکا کہ جس لڑکی کی عصمت لٹی ہے' کون ہے اور کہاں ہے؟ اور سب سے اہم بات حضورِ والا ...... کہ مثل میں عصمت دری کی کوئی ڈاکٹری رپورٹ شامل نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کی بنیادی وجہ عصمت دری نہیں کچھ اور ہے ...... جس پر ملزم پردہ ڈالنا چاہتا ہے ...... جنابِ والا ...... ملزم کو قتل کی اصل وجہ بتانا پڑے گی اور یہ بھی کہ اس نے عصمت دری کا ڈھونگ کیوں رچایا؟"

سرکاری وکیل کے دلائل اتنے زور دار تھے کہ سیشن جج کسی حد تک اس

سے متاثر نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے میری طرف دیکھا۔

"میں ملزم عدیم پر زور دوں گا کہ لڑکی کو عدالت میں پیش کیا جائے۔ اس بات سے ملزم اور قانون دونوں کو آسانی ہو گی اور نتائج اخذ کرنے میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہے گی!"

میں نے گذارش کی۔

"جناب والا ...... قتل کے وقت سرتل ہماری کوٹھی میں موجود تھی اور اسی نے مجھے اقرار جرم سے روکا تھا۔ چونکہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے' اس لئے اس کی خودکشی کی دھمکی پر میں نے نتیجتاً قتل کا اعتراف نہ کیا ...... لیکن جب اگلی صبح معلوم ہوا کہ سرتل اور اس کا باپ دونوں ہمارا گھر چھوڑ چکے ہیں تو قتل کا اعتراف نہ کرنے کی مصلحت بھی ختم ہو گئی اور میرے ضمیر نے مجھے مجبور کیا کہ خود کو قانون کے حوالے کر دوں ...... جنابِ والا ...... ان حالات میں مَیں سرتل کو کہاں ڈھونڈوں؟ عدالت سے زیادہ خود مجھے اس کی ضرورت ہے!"

میرے بیان پر سرکاری وکیل نے اعتراض کیا۔

"جناب والا ...... ملزم کے بیان سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ لڑکی کی داستان محض فرضی ہے اور جرم کی نوعیت کو بدلنے کے لئے گھڑی گئی ہے"۔

وکیل صفائی پھر آڑے آ گیا۔

"جناب والا ...... لڑکی کی داستان فرضی نہیں ہے۔ پولیس کی ابتدائی رپورٹ میں لڑکی کا ذکر موجود ہے ...... ہاں یہ الگ بات ہے کہ مقدمہ کو کامیاب بنانے کے لئے پولیس نے لڑکی کو غائب کر دیا ہو ...... اور یا خود لڑکی بدنامی کے ڈر سے اتنی دور چلی گئی ہو' جہاں سے اس کی واپسی ناممکن ہو!"

لیکن ابھی وکیل صفائی کے دلائل ختم نہیں ہوئے تھے کہ اچانک سرتل عدالت میں داخل ہو گئی ......

"میں حاضر ہوں وکیل صاحب' میں حاضر ہوں!"

سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ کٹہرے کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی ...... اور جج سے مخاطب ہوئی۔ "جج صاحب' یہ کیسی اندھیر نگری ہے۔ قاتلہ تو باہر عیش کر رہی ہے اور بے گناہ قاتلوں کے کٹہرے میں کھڑا ہے!!"

جہاں سرتل کی اچانک آمد پر مجھے مسرت ہوئی' وہاں اس کے اقرارِ جرم پر میں نے شدید احتجاج کیا اور چیخ کر اسے ٹوکا۔

"سرتل ......!"

مگر اس نے میرے احتجاج اور چیخ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جج صاحب ...... قاتل عدیم نہیں' میں ہوں!"

میں نے سختی سے تردید کی۔

"یہ جھوٹ کہتی ہے جنابِ والا"۔

"میں سچ کہتی ہوں جج صاحب"۔ اس نے میری بات کاٹی۔ "عصمت میری لٹی تھی' قتل بھی میں نے کیا ہے"۔

اس لمحے سرکاری وکیل نے پھر مداخلت کی۔

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تمہاری عصمت لُٹی ہے؟"

اس نے سرکاری وکیل کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"بھری عدالت میں اعلان کر رہی ہوں وکیل صاحب' پھر بھی آپ کو شبہ ہے کہ میں جھوٹ کہتی ہوں۔ ایک کنواری لڑکی کی زندگی میں زلزلہ آ گیا۔ سب لٹ پٹ گیا مگر وکیل صاحب کو ثبوت کے لئے کاغذی پیراہن کی ضرورت ہے۔ یہ لیجئے ثبوت"۔ اس نے کاغذ وکیل کی طرف بڑھایا۔ "اچھی طرح آنکھیں کھول کر دیکھ لیجئے

اور جج صاحب کو بھی بتا دیجئے کہ کس طرح ایک بے بس و بے کس لڑکی کا مستقبل مٹی میں ملا دیا گیا؟"

وکیل نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کا معائنہ کیا اور پھر خاموشی سے جج کو تھما دیا۔

سرتل نے بات جاری رکھی۔

"جج صاحب' عدیم کو چھوڑ دیجئے' یہ تو جذباتی ہو کر خوامخواہ کٹہرے تک پہنچ گیا ہے ...... مجھ سے محبت کرتا ہے نا' اس لئے دار پر چڑھنے کے لئے بے تاب ہے۔ جس دن میں نے ان کے ڈیڈی کو قتل کیا تھا' اس دن بھی یہ مجھے بچانے کے لئے پہنچ گئے تھے اور قتل کا الزام اپنے سر لے رہے تھے"۔ مگر سرکاری وکیل ان باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ اُس نے جج سے کہا۔

"جنابِ والا' جو کچھ یہ لڑکی کہتی ہے' اگر یہ سچ ہے تو پہلے دن ان دونوں نے پولیس کو دھوکہ کیوں دیا کہ سیٹھ داؤد نے خود کشی کی ہے؟"

"واہ ...... !" سرتل تمسخرانہ لہجے میں وکیل سے مخاطب ہوئی۔ "یہ بھی کوئی بات ہوئی وکیل صاحب! عدیم صاحب نے جب دیکھا کہ ایک تو میری عزت لٹ چکی ہے اور اس پر اب قتل کے جرم میں ذلیل ہوتی رہوں گی تو انہوں نے جرم اپنے سر لینے کی کوشش کی لیکن میرا کیا فرض تھا جج صاحب ...... کہ اپنی خاطر ایک بے گناہ کو جیل بھجوا دیتی ...... ؟ نہیں! بلکہ میں نے عدیم صاحب کو مجبور کیا کہ سیٹھ صاحب کی موت کو خودکشی کہا جائے' ورنہ میں زہر کھالوں گی۔ پھندا لگا لوں گی ...... !!"

اب سرکاری وکیل نے ایک اور پینترا بدلا۔

"جب تم دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا تھا تو پھر دوسرے دن عدیم صاحب کو اقبالِ جرم کی ضرورت کیوں پڑی ...... ؟"

"یہ بہت بھولے ہیں وکیل صاحب"۔ اس نے پہلے وکیل کو اور پھر جج کو مخاطب کیا ......" جج صاحب' واقعی یہ بہت بھولے ہیں۔ میں گھر سے اس لئے نکلی تھی

کہ اس شریف آدمی کو عذاب سے بچاؤں گی چند دن روئے گا دھوئے گا' پھر مجھے بھول جائے گا۔ کسی اچھے گھرانے میں شادی کر لے گا اور اس کا گھر آباد ہو جائے گا لیکن یہ ایسا پگلا نکلا اِدھر میں گھر سے نکلی' اُدھر یہ گھر سے نکلا یہ احساس لے کر کہ کہیں سرتل سیٹھ صاحب کے قتل کا اقرار نہ کرے' خود تھانے پہنچ کر قاتل بن بیٹھا ...... ؟"

مگر سرکاری وکیل نے ایک اور سوال داغ دیا۔

"اور تم اس عرصہ میں کہاں رہیں؟"

سرتل کو غصہ آگیا۔

"میں آسمان پر چڑھ گئی تھی وکیل صاحب' کاش ...... میں آپ کی بیٹی ہوتی' پھر آپ سے پوچھتی کہ بیٹیوں پر ایسا وقت آجائے تو انہیں کہاں جانا چاہیے؟"

سرکاری وکیل نے احتجاج کیا۔

"جنابِ والا ...... یہ لڑکی ذاتی سطح پر آکر ہماری توہین کا باعث بن رہی ہے"۔

سیشن جج نے وکیل سے اتفاق کیا اور سرتل کو ٹوکا۔

"لڑکی ...... جذباتی نہ بنو۔ قانون کا تقاضا ہے کہ جو سوال کیا جائے اسی کا جواب دیا جائے"۔

مگر سرتل نے نہایت خوبصورتی سے بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔

"ان سے بھی کچھ کہئے نا جج صاحب' دل جلانے کی باتیں کرتے ہیں۔ دل جلوں سے اور کیا سُنیں گے ...... یہی کہنے کی گنہگار ہوں نا کہ سیٹھ داؤد کو میں نے قتل کیا ہے۔ بھلا انہیں کیا ضد ہے کہ سزا مجھے نہ ملے عدیم کو ملے؟"

جج نے نرمی سے پوچھا۔

"کوئی عینی گواہ ہے جو تمہاری باتوں کی تائید کر سکے؟"

"میں گواہ کہاں سے لاؤں جج صاحب' ایک عدیم صاحب ہیں' سب کچھ جانتے

ہیں، مگر غلط بات پر اڑ گئے ہیں۔ اب میں اور ثبوت کہاں سے لاؤں؟"

جج ایک حد تک گویا اس کی باتوں میں آگیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

"قانون کی مدد کرنے کے لئے میں ملزم عدیم سے کہوں گا کہ اگر واقعی قتل انہوں نے نہیں کیا تو وہ جرم سے انکار کر سکتے ہیں۔ عدالت اس انکار کو قانون کی امداد سے تعبیر کرے گی"۔

میں نے بے بسی اور لاچارگی سے کہا۔

"جنابِ والا، یہ قانون کا احترام ہی تھا جو مجھے تھانہ اور کچہری تک لے آیا۔ سرتی نے جو کچھ کہا ہے، وہ بظاہر درست بھی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ عزت لٹ جانے کے بعد اس کو ہر آدمی انتقام لینے میں حق بجانب سمجھتا ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ قتل میں نے کیا ہے۔ سرتی محض مجھے بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے!"

میں نے بات ختم کی ہی تھی کہ اس لمحے مالی بابا عدالت میں داخل ہوا اور سرتی کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

"یہ غلط ہے جنابِ والا، جو کچھ عدیم صاحب نے کہا ہے، غلط ہے۔ قتل عدیم صاحب نے نہیں، سرتی نے کیا ہے"۔

میں نے ایک بار پھر احتجاج کیا۔

"مالی بابا ......"

مگر جج نے میرے احتجاج کو نظرانداز کرتے ہوئے مالی بابا کی طرف دیکھا۔

"تم کون ہو بھئی؟"

"میں عدیم صاحب کا مالی ہوں جج صاحب اور اس بد نصیب لڑکی کا باپ ہوں۔ دراصل جو کچھ سرتی نے کیا ہے، مجھے کرنا چاہئے تھا لیکن میں سیٹھ صاحب کا تیس سالہ نمک خوار تھا، ہمت نہ کر سکا اور مجبوراً" میری بیٹی کو یہ کام کرنا پڑا!"

میں نے حالات بگڑتے دیکھ کر ایک بار پھر مداخلت کی۔

"مالی بابا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

وہ نہایت تسلی سے بولا۔

"عدیم بیٹے، مجھے سچائی کے راستے سے نہیں ہٹنا چاہئے ......"

پھر اس نے جج کی طرف دیکھا ...... "جج صاحب، اگر میں مقدمے کو الجھانا چاہتا تو بہت آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ قتل ان دونوں نے نہیں، میں نے کیا ہے۔ اس طرح عدالت کو اصل قاتل کا کھوج لگانے میں بہت مشکل پیش آتی لیکن میں عدالت کی کاروائی کو آسان بنانے کے لئے اصلی مجرم کی نشاندہی کر رہا ہوں ...... قاتلہ میری بیٹی سرتی ہے!"

سرکاری وکیل جو چند لمحے کے لئے خاموش ہو گیا تھا ...... ایک نئے اعتراض کا سہارا لیا۔ اس نے کہا۔

"جنابِ والا، میں پوچھتا ہوں، اتنا عرصہ ان لوگوں نے قتل پر پردہ ڈالے رکھا اور عین اس وقت جب ملزم عدیم کے خلاف ثبوت مکمل ہو چکا ہے تو یہ لوگ اصلی ملزم کی نشاندہی کے لئے پہنچ گئے۔ عدالت کو اس نکتہ پر غور کرنا ہوگا؟"

اب وکیل صفائی نے اس کے اعتراض پر اعتراض کیا۔

"جنابِ والا، یہ کوئی ایسا نکتہ نہیں ہے کہ جس میں ملزمہ کے اقبال جرم کی تردید ہوتی ہو ...... کہا جاتا ہے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہتے۔ اگر ملزمہ کے ضمیر نے اسے مجبور کیا کہ ایک بے گناہ کو سزا سے بچانا چاہئے تو قانون کو ملزمہ کے اقدام کو سراہنا چاہئے کیونکہ وہ عدالت کو صحیح نتیجے پر پہنچنے میں معاون ثابت ہو رہی ہے!"

سیشن جج جو نہایت غور سے متعلقہ لوگوں کی باتیں سن رہا تھا، عدالت اور سامعین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"عدالت کو پہلی بار ایک ایسے مقدمے سے واسطہ پڑا ہے جس میں طرفین

جذباتی طور قتل کا اعتراف کر رہے ہیں ...... اور یہ حقیقت ہے کہ جذباتی سچائیوں کی اس کشمکش میں عدالت کو اصل مجرم کا سراغ لگانے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ محبت کے پاکیزہ جذبے کا یہ انداز دیکھ کر، جس میں عدیم اور سرتل ایک دوسرے پر دیوانہ وار قربان ہونے کا مظاہرہ کر رہے ہیں، عدالت قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے لیکن قانون کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ حالات اور واقعات کی روشنی میں ملزمہ سرتل کو حراست میں لینے کا حکم دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ملزم عدیم بھی اس وقت تک حراست میں رہے گا، جب تک عدالت کسی نتیجے پر پہنچ نہیں جاتی ...... عدالت کی کاروائی ایک ہفتے کے لئے ملتوی کی جاتی ہے"۔

میں نے دیکھا ...... سرتل اس اعلان سے بہت خوش ہوئی۔ اس نے فتحمندانہ نگاہوں سے میری طرف اور پھر باپ کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، باپ بیٹی دونوں سمجھوتہ کر کے آئے ہیں۔

اگلی تاریخ پر عدالت میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ عوام کے علاوہ بہت سے وکلاء بھی فیصلہ سننے آئے تھے۔ میں اور سرتل آمنے سامنے کے کٹہروں میں کھڑے تھے۔ سیشن جج غالباً" اپنا لکھا ہوا فیصلہ پڑھنے میں محو تھا۔ سرتل کی نگاہیں مجھ سے ملتیں، ایک دو لمحوں کے لئے ......

اس اتصال میں ایک عجیب احساس تھا، خاکساری اور تفاخر کا ...... میں اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میرے سینے میں جو الجھن اور کشمکش تھی، اس کا ردِ عمل میرے چہرے پر بھی ضرور ہو گا لیکن سرتل خاموش اور سنجیدہ دکھائی دینے کے باوجود بشاش تھی اور اس کے چہرے پر کوئی کھچاؤ نہیں تھا ...... اس کی آنکھوں میں طمانیت تھی اور اس کے خوبصورت ماتھے پر کوئی شکن نہیں تھی ......

اچانک سیشن جج نے مثل سے نظریں اٹھائیں۔ اس کے چہرے پر انتہائی اطمینان اور تسلی تھی اور آنکھوں میں مہر و محبت کی چمک۔

سیشن جج نے بھاری بھر کم آواز میں فیصلہ سنانا شروع کیا۔

"وکلاء کی بحث اور مقدمہ کی ساری کاروائی، عدالت مسلسل ایک ہفتے تک اس پر غور کرتی رہی ہے ...... سیٹھ داؤد کا قتل ہوا ہے اور واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ کٹہرے میں کھڑے دونوں ملزموں میں ایک یقیناً" قاتل بھی ہے ...... لیکن دونوں میں سے قاتل کونسا ہے؟ یہی وہ سوال ہے جو عدالت کو کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے میں آڑے آتا رہا ہے ...... اس کے باوجود عدالت چند نتائج اخذ کر سکی ہے ...... اول یہ کہ دونوں میں سے قاتل کوئی بھی ہو مگر اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ قتل اشتعالی جذبات کا ردِ عمل ہے ...... دوئم یہ کہ ملزمہ سرتل اور ملزم عدیم نے جس نیت اور جذبے سے اقبال جرم پر اصرار کیا ہے، اسے بھی نظرانداز نہ کیا جائے ...... سوئم یہ کہ اگرچہ قانون کی نظر میں جذباتی لب ولہجے کے مقابلے میں ٹھوس حقائق کو ترجیح دی جاتی ہے لیکن اس مقدمے کے مزاج میں شک و شبہ اس طرح رچ بس گیا ہے کہ اصل قاتل تک پہنچنے میں قانون کو دقت پیش آ رہی ہے۔ لہٰذا میں قانون کی رعایت سے کہوں گا کہ ملزمان کو اس شک کا فائدہ ملنا چاہئے۔ میں ملزم عدیم اور ملزمہ سرتل کو باعزت طور پر بری کرتا ہوں!"

میں فیصلہ سننے کے بعد اسی طرح سنجیدہ کھڑا تھا مگر سرتل خوشی کو ضبط کر رہی تھی ...... وکلاء اور عوام مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ اسی ہجوم میں مالی بابا مجھ تک پہنچ گیا تھا ...... لیکن میں جن حالات میں بری ہو گیا تھا، اس پر خوش نہیں تھا۔ میں شک کا فائدہ حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اگر سزا سے بچنا ہی مقصود ہوتا تو پھر مقدمے کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اس قتل کو خودکشی کہہ کر بھی آسانی سے بچ سکتا تھا لیکن ایک ہستی ایسی تھی جو مجھے بچانے پر بضد تھی۔

اگر میں نے پہلی بار اس کا کہا مانا تھا اور قتل کو خودکشی کہہ دیا تھا تو اب اس

کی ضد کیونکر نظرانداز کر سکتا تھا!

تو کیا مجھے اس کے لئے جینا ہو گا؟

یہی وہ سوال تھا ...... جس نے مجھے کٹہرے سے نیچے اترنے پر آمادہ کیا۔ مجھے ایک مظلوم لڑکی کا ساتھ دینا تھا۔ اس کا کھویا ہوا وقار بحال کرنا تھا اور اس کو عزتِ نفس کے ساتھ زندگی سے ہمکنار کرنا تھا۔

چنانچہ مالی بابا اور سرتل کو ساتھ لے کر میں واپس آ گیا۔ ایک بار پھر میرا کمرہ تازہ پھولوں کی مہک سے معطر ہو گیا اور میری صبحیں گنگنانے لگ گئیں۔

بس، اب وہ دن آیا ہی چاہتا تھا کہ میں سرتل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا لیتا ...... میں چپکے چپکے شادی کی تیاری کر رہا تھا۔ کپڑے اور زیور بن رہے تھے۔

۵۵

ایک صبح جب سرتل نے تازہ پھولوں کا گلدستہ سجایا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور تکیئے کے نیچے سے ایک خوبصورت انگوٹھی نکال کر اس کی نازک انگلی میں پہنا دی۔

اس نے بھرپور آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ دیں ...... چند لمحے خاموشی سے تکتی رہی پھر ہونٹ کاٹنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے ......

"سرتل ......!"

میں پریشان ہو کر اٹھ بیٹھا اور اس کا ہاتھ سہلانے لگ گیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر پڑے۔

"یہ کیا سرتل! یہ سب کیا ہے؟" میں نے مضطربانہ پوچھا۔

"عدیم صاحب!" اس کی آواز جیسے دور کہیں کنوئیں میں سے ابھری۔

"آپ کو اپنی محبت میں اتنا پرجوش، اتنا سرشار دیکھتی ہوں تو اپنی تقدیر پر رونا آ جاتا ہے۔ اپنی بے بسی پر آنسو نکل آتے ہیں!!"

"مگر کیوں ......؟ کیا تمہیں میرے کہنے کا یقین نہیں؟"

"یقین آتا ہے عدیم صاحب، یقین آتا ہے"۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "تبھی

روتی ہوں ، تبھی اپنی قسمت کو کوستی ہوں"۔

مگر میں اس کے دکھ کو نہ سمجھ سکا۔

"آخر بات کیا ہے سرتل' اپنا سمجھتی ہو تو صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتی؟"

وہ خاموش ہو گئی اور حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ میں نے سٹپٹا کر کہا۔

"ایسی نظروں سے دیکھتی ہو کہ کلیجہ کانپ کانپ جاتا ہے۔ خدا کے لئے بتا دو ، تمہارے ضمیر میں کیسا کانٹا چبھ گیا ہے کہ نکالے نکلتا نہیں؟"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"بتانے میں تو کچھ نہیں ہے عدیم صاحب' پر آپ کا دکھ دیکھا نہیں جائے گا۔ جن آنکھوں میں پیار کے شعلے بھڑکتے دیکھ رہی ہوں' انہیں پلک جھپکنے میں پھونک مار کر بجھا دوں ، ایسی ظالم میں کیسے بن جاؤں ......!"

میں نے اعتماد سے کہا۔

"مجھ میں اتنی ہمت ہے سرتل کہ ہونی انہونی دونوں سن سکوں، پر ایسے امتحان میں نہ ڈالو کہ تمہارے دکھ تمہارے دامن سے الجھے رہیں اور میں ان میں سے کوئی حصہ نہ بانٹ سکوں۔

"عدیم صاحب"۔ اس کی آواز پھٹ سی گئی۔ "میری زبان پر چھالے پڑ گئے ہیں۔ بولوں گی تو پھٹ جائیں گے۔ ان کا زہر میرے پیٹ میں چلا جائے گا۔ وہاں آپ کے ڈیڈی کی امانت پل رہی ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ آپ کا سامنا کیسے کروں گی!"

وہ روتی ہوئی بھاگ گئی ...... مجھے جیسے سکتہ ہو گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے ایک شکاری کا روپ دھار لیا ہے اور وہ معصوم پرندوں پر بندوق داغ رہی ہے اور بے گناہ جانیں گر رہی ہیں ، تڑپ رہی ہیں'

زمین کے ٹھنڈے سینے پر گرم لہو گرنے کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔

یعنی بے فائدہ اور بے مقصد ...... جس کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ ناکردہ گناہی کا یہ عجیب صلہ ہے۔ سماج تہذیب اور زندگی کا کوئی پہلو بہرہ ور نہیں ہوتا ...... انسان دیکھتا رہ جاتا ہے اور تمناؤں کے ہجوم کے ہجوم خاک میں مل جاتے ہیں مگر پھر بھی جینا ضروری ہوتا ہے اور آدمی مضطرب ذہن کے ساتھ زندگی کا بوجھ اٹھائے مارا مارا پھرتا ہے اور باؤلے کتے کی طرح زندگی کے مفہوم سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔

اس دن بھی میری ذہنی کیفیت کچھ اسی طرح کی تھی۔ میں پریشان تھا' مضطرب تھا اور بے تابی سے ہسپتال کے لمبے برآمدے میں ٹہل رہا تھا ...... کہ اتنے میں لیڈی ڈاکٹر بمع نرس کے سرتل کے کمرے سے نکلیں۔ میں لپک کر ان کی طرف بڑھا۔

"کیا ہوا ڈاکٹر......؟"

لیڈی ڈاکٹر ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

"بچہ قدرتی طریقے سے پیدا نہ ہو سکے گا!"

"پھر......!" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"اپریشن کرنا پڑے گا"۔ وہ اُسی مشینی لہجے میں بولی۔

"ڈاکٹر......!" میری آواز میں التجا تھی۔

"کیس بہت پیچیدہ ہے"۔ اس نے وضاحت کی ...... "زچہ اور بچہ دونوں میں سے ایک کی قربانی دینا ہو گی!"

"ڈاکٹر......!" میں اور زیادہ گھبرا گیا۔

"آپ بتا دیجئے۔ بچے کی جان بچائی جائے یا ماں کی؟"

"دونوں کی ڈاکٹر' دونوں کی"۔ میں نے گڑگڑا کر کہا۔

"یہ بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے"۔

"اس صدی میں کوئی بات نا ممکن نہیں ہے ڈاکٹر۔ لاکھ دو لاکھ جتنا بھی خرچ ہو' میں تیار ہوں"۔

"یہ پیسوں کی نہیں ٹیکنیکل بات ہے مسٹر عدیم۔ سائنس ابھی موت پر قادر نہیں ہوئی"۔

"میری مجبوری کو سمجھئے ڈاکٹر۔ بچہ مر گیا تو میرا ضمیر مر جائے گا۔ اس کی ماں مر گئی تو میری محبت مر جائے گی"۔

"اس کی ماں بچ سکتی ہے"۔ ڈاکٹر بولی۔

"بچے کو بھی بچانا ہو گا' ورنہ فرض مر جائے گا۔ اصول مر جائیں گے' سچائی مر جائے گی۔ میری روح مجھے ہمیشہ ستاتی رہے گی کہ میں نے زمانے کے ڈر سے ایک معصوم کی جان لے لی ہے"۔

ڈاکٹر نے پہلی بار قدرے حیرت کا اظہار کیا۔

"ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ؟"

"اس لئے کہ یہ بچہ امانت ہے۔ ایک آزمائش ہے ایک امتحان ہے اسے ظلم اور معصومیت نے مل کر جنم دیا ہے۔ میں اس کی حفاظت کروں گا۔ اسے پروان چڑھاؤں گا۔ مجھے بچہ چاہئے ڈاکٹر' مجھے بچہ چاہئے!"

میں تقریباً رو پڑا۔ ڈاکٹر اور نرس حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اسی لہجے میں بات جاری رکھی۔

"مجھے اس کی ماں بھی چاہئے۔ مجھے اس سے بے پناہ محبت ہے۔ ڈاکٹر' مجھے دونوں چاہئیں دونوں ...... ڈاکٹر تم خود ہی فیصلہ کر لو کہ مجھے کون چاہئے!"

میں ہچکیاں لیتا ہوا ایک ستون سے لپٹ گیا ...... ڈاکٹر اور نرس حیرت زدہ کھڑی تھیں۔ انہیں شاید پہلی بار ایسے عجیب و غریب کیس سے واسطہ پڑا تھا۔

پھر وقت کیسے گزرا۔ مجھے یاد نہ رہا......

میں اپنا سر دونوں گھٹنوں میں دبائے بینچ پر بیٹھا تھا کہ ایک نرس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا ...... میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اندر جانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ میں تیزی سے اٹھا اور لپک کر کمرے کے اندر چلا گیا۔

سرتی آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔ گردن تک سفید چادر سے اس کا جسم ڈھکا ہوا تھا ...... ایک نوزائیدہ بچہ اس کے پہلو میں سو رہا تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ چکا تھا۔ اس کے گیلے گیلے غلافی پپوٹے بند تھے ...... بالکل بے حس و حرکت ......

وراثت میں ملے ہوئے اس کے تازہ تازہ' بھرے بھرے کشمیری ہونٹ بند تھے ...... میں آہستہ سے اس کے قریب بیٹھ گیا اور بڑی عقیدت سے اس کی چاند سی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ ہمیشہ کی طرح اس کی خوبصورت آنکھوں میں محبت کے کنول کھل رہے تھے۔ اس کے لبوں پر لطیف سا تبسم تھا۔ اس کی آواز انتہائی کمزور تھی۔

"آپ آ گئے ...... دو گھڑی مہلت آپ سے بات کرنے کی مانگی تھی خدا سے' چلو ایک تمنا تو پوری ہو گئی!"

"تم کیا کہہ رہی ہو سرتی"۔ میں گڑبڑا گیا۔ "میں تجھے مرنے نہیں دوں گا"۔

ایک فردوسی مُسکان اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

"سب باتیں مان جاؤں گی' پر موت کی وادی سے واپس نہ بلانا' ورنہ روٹھ جاؤں گی۔ اور قیامت میں بھی بات نہ کروں گی آپ سے"۔

"سرتی ......!" میں جذباتی ہو گیا۔

"نہیں نہیں ...... آنسو نہ گرانا عدیم ...... آخری لمحوں میں تم رؤو گے تو مجھے سہارا کون دے گا ...... ہوں ...... لاؤ تمہارے آنسو پونچھ دوں"۔

اس کا کمزور ہاتھ چادر سے نکلا۔ اس نے میرے آنسو پونچھ لئے۔

"عدیم صاحب .... عدیم .... کتنے اچھے ہو تم.معاف کرنا آج پہلی بار آپ کی بجائے تم کہہ رہی ہوں۔ موت کے سمے گستاخ ہو گئی ہوں نا؟"

"سرتی .... !" میں زار و قطار رو پڑا۔

"ناں' ناں روؤ مت' روؤ مت"۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا۔ زچہ اور بچہ دونوں میں سے ایک کی جان بچ سکتی ہے۔ تم بتاؤ' کس کی جان بچائی جائے؟ میں نے جواب دیا۔ ہم دونوں کا وجود اس زمین پر بار ہے۔ ہم دونوں کو ختم کر دیں !"

"نہیں سرتی نہیں !" میں نے اس کا ہاتھ سینے سے لگا لیا۔

"عدیم"۔ اس نے بچے کی طرف دیکھا ...... "دیکھ رہے ہو نا' ڈاکٹر نے اسے بچا لیا ہے۔ میں بھی اس کا گلا نہیں دبا سکی مگر یہ کیسا عجیب بچہ ہے .... یہ تمہارے باپ کا بیٹا ہے اور اس عورت کا بھی بیٹا ہے' جس سے تم نے پیار کیا ہے۔ اس کی رگوں میں جو خون ہے' اس میں تمہارا بھی حصہ ہے۔ میرا بھی حصہ ہے مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھو .... نہ اپنے باپ کے بیٹے کو بھائی کہہ سکتے ہو اور نہ اپنی محبوبہ کے بیٹے کو بیٹا کہہ سکتے ہو؟"

میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"سرتی .... ! یہ تمہاری نشانی ہے۔ میں اسے سینے سے لگاؤں گا۔ یہ سمجھ کر نہیں کہ اس کی رگوں میں میرے باپ کا خون دوڑ رہا ہے بلکہ یہ سمجھ کر کہ یہ میری سرتی کا لخت جگر ہے"۔

"جذباتی باتیں نہ کرو"۔ اس کی آواز اور زیادہ کمزور پڑ گئی۔ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر باہر آنے لگے۔ "عدیم .... تم جس معاشرے میں رہتے ہو' وہ اسے بے گناہ نہیں سمجھے گا۔ کوئی بھی اسے معصوم اور بے قصور نہیں کہے گا"۔

"نہیں سرتی نہیں' ایسا ہرگز نہیں ہو گا .... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ بچہ' جس نے ظلم' بے انصافی اور بربریت کی آغوش میں جنم لیا ہے ، ایک روز اسی آغوش کو تار تار کرے گا !"

میں نہیں جانتا' میں نہیں جان سکا کہ میرا وعدہ اور پیغام اس تک پہنچ سکا تھا یا نہیں .... کیونکہ وہ ہاتھ جو میں نے سینے سے لگا رکھا تھا .... ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

سرتی ختم ہو چکی تھی .... !!

سر اور تال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے تھے .... مالی بابا کے کسی پنڈت دوست نے سر اور تال کی رعایت سے اس بچی کا نام سرتی رکھا تھا۔

ماں چل بسی تو بچہ جاگ پڑا۔

اسے دودھ کی ضرورت تھی یا ممتا کا غم .... وہ زور زور سے رونے لگ گیا .... میں نے نومولود کو اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ یہ وہ سینہ تھا جو چند لمحے پہلے ایک ٹھنڈے ہاتھ کا ذائقہ چکھ چکا تھا ۔ یہی وہ سینہ تھا کہ اب ایک معصوم جسم کی گرمی کا ذائقہ چکھ رہا تھا ....

اور تقویت حاصل کر رہا تھا۔

اور زندگی مجھے پکار رہی تھی ......

عدیم نے کہانی ختم کر کے جج کی طرف دیکھا۔

٥٥

"جنابِ والا ...... زندگی کا یہی وہ ذائقہ تھا ...... جس کے سہارے میں اب تک زندہ رہا ...... یہی وہ ذائقہ تھا جس نے اٹھائیس سال تک میری روح کو شاداب رکھا ...... یہی وہ ذائقہ تھا جو باون برس کی عمر تک میرے ضمیر کو سہلاتا رہا۔

"جنابِ والا ......"

ادھیڑ عمر عدیم نے چاروں طرف دیکھا۔

نوجوان جج خاموش اور سنجیدہ بیٹھا تھا ...... اس کی آنکھوں میں عدیم کی کہانی کا تاثر صاف دکھائی دے رہا تھا ...... عدالت میں ایک پُروقار سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وکلاء خاموش تھے اور سامعین دم بخود۔

"جنابِ والا ...... اس طرح صبح کے شگفتہ پھولوں میں جنم لینے والی کہانی آنسوؤں کا کفن پہن کر ختم ہو جاتی ہے ...... اور جنابِ والا' یہ تھے وہ اسباب جو مجھے عدالت کے کٹہرے تک لے آئے ہیں۔ پھول بکھر چکے ہیں' سر اور تال خاموش ہو چکے ہیں۔ میں زندگی کے باون برس پورے کر چکا ہوں مگر پھر بھی ایک حسرت باقی ہے

کہ وقت کا قانون میرے ساتھ انصاف کرے۔ میں مرنے سے قبل یہ اطمینان چاہتا ہوں کہ میں نے دنیا میں جو کام کئے ہیں' میں اس میں حق بجانب تھا ....

"جنابِ والا .... یہی آرزو لے کر میں اٹھائیس برس کے بعد آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں اور انصاف مانگتا ہوں.......

"بس میری کہانی ختم ہوتی ہے!"

عدالت میں اسی طرح خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب کی نظریں عدیم پر جمی ہوئی تھیں۔ سب کی آنکھوں میں احترام اور پیار تھا ...... عدیم نے لوگوں کا ردِ عمل اور عدالت کی متانت کو محسوس کیا۔

"جنابِ والا .... عدالت میں میری آواز اور حاضرین کے دل کی دھڑکنوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا ...... ارکان جیوری خاموش ہیں ...... سامعین اداس ہیں۔ اگر عدالت کا اصرار اور انصاف کا تقاضا نہ ہوتا تو میں ہرگز اس تلخ نوائی کی جرأت نہ کرتا ......"

جج نے نرم اور متین لہجے میں کہا۔

"عدالت کو آپ کی صاف گوئی سے صدمہ نہیں' خوشی ہوئی ہے۔ قانون کا احترام اور انصاف کا تقاضا ہر چیز پر مقدم ہے .... مقدمہ کی تفصیلات' استغاثہ کی باتیں وکیلِ صفائی نے سن لی ہیں .... ملزم اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے۔ یہ اقرار وہ دوسری بار کر رہا ہے....... اب وکیل صفائی ان کی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں جنابِ والا" .... وکیل صفائی نے نہایت اعتماد سے بات شروع کی۔

"مقدمہ کی ساری تفصیلات سننے کے بعد کوئی بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ میرے مؤکل جیسا شریف النفس آدمی قاتل ہو سکتا ہے.... اور بفرضِ محال اسے قتل تصور بھی کر لیا جائے تو اس قتل کے لئے کتنے جواز موجود ہیں......

جنابِ والا .... ایک بے کس لڑکی کی عزت کے لئے بیٹا اپنے باپ کو قتل

کرتا ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ قتل کسی رقیب کا نہیں' اپنے باپ کا کرتا ہے ...... جنابِ والا ...... سمجھا جائے کہ اس قتل کی تحریک میں کونسا جذبہ کار فرما تھا ...... دیکھا جائے کہ قاتل کی نیت کتنی نیک تھی ...... وہ ایک بے آسرا لڑکی کی تسلّی کے لئے قتل کرتا ہے۔ اسے زندہ رہنے کا پیغام دیتا ہے ...... اسے اپنے عمل سے بتاتا ہے کہ اگر اس سرزمین پر بدی کا وجود ہے تو نیکی بھی ابھی زندہ ہے ...... وہ اپنے کردار سے ثابت کرتا ہے کہ اگر یہاں ظالم موجود ہے تو ظالم کو للکارنے والی زبان بھی موجود ہے ......

"جنابِ والا ...... واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ 'یہ ایسا قتل ہے جسے آسانی سے خودکشی کہہ کر چھپایا جا سکتا تھا۔ حالات کی مجبوری کے تحت ایسا کیا بھی گیا ...... مگر نہیں ......!

"میرا مؤکل نہ تو عادی مجرم تھا اور نہ مجرمانہ ذہن رکھتا تھا ...... چنانچہ وہ اگلے دن اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر پولیس سٹیشن پہنچ گیا ...... انصاف کا دروازہ کھٹکھٹایا ......

"اور جنابِ والا ...... عدالت سے باعزت طور پر بری ہو گیا ...... لیکن کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی ...... چند دن کے بعد اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ گناہ کا بویا ہوا بیج اس معصوم لڑکی کے پیٹ میں پروان چڑھ رہا ہے ...... چنانچہ وہ آگے بڑھتا ہے اور معاشرے کی بڑی بڑی آنکھوں سے اس بے کس لڑکی کا مستقبل بچانے کی ذمہ داری اٹھاتا ہے ...... مگر شومئی قسمت' ایک روز یہ لڑکی اسے داغِ مفارقت دے کر اکیلا چھوڑ دیتی ہے۔ ملزم کے لئے اقبالِ جرم کا ایک موقع اور پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کے لئے تیار ہے ...... لیکن دوسرے لمحے اس کی نظر ہنستے ہوئے اس معصوم بچّے پر پڑتی ہے جو معاشرے کی نظر میں گالی' سماجی حیثیت میں گناہ اور قانون کی نگاہ میں جرم ہے وہ اس بے گناہ معصوم بچے کو زندگی' ایک خوبصورت زندگی دینا

چاہتا ہے۔ ...... حالانکہ وہ اس کا گلا بھی گھونٹ سکتا تھا۔ جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہیں اور قانون ان سے باز پرس کرتا ہے ...... میں پوچھتا ہوں کہ جو لوگ ناجائز بچوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں' قانون انہیں سزا دیتی ہے اور ٹھیک دیتی ہے۔

"لیکن جو لوگ ایسے معصوم بچوں کو پروان چڑھاتے ہیں' انسان بناتے ہیں۔ قانون انہیں کیا انعام دے گا ......؟ معاشرہ انہیں کس طرح نوازے گا ......؟

"جنابِ والا ...... غور فرمایا جائے ...... ایسے آدمی کو انعام ملنا چاہیئے یا سزا' جس نے معاشرے کو ایک مکمل انسان دیا ...... اور جب اس کے مقصد کی تکمیل ہو گئی تو وہ ایک بہادر اور سچے انسان کی طرح عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو گیا......

"میں کہتا ہوں اور بہانگِ دہل کہتا ہوں کہ اگر ملزم نے کوئی جرم کیا بھی ہے تو وہ اتنا بڑا کہاں ہے' جتنا کہ وہ خود عظیم ہے ...... جنابِ والا ...... مجھے کہنے دیجئے' کہ یہ ملزم نہیں ...... انسانیت کا وہ نمونہ ہے جو زندگی کو قدریں' زمانے کو مثالیں اور قانون کو امتحان میں ڈال دیتا ہے ...... میں بحث ختم کرنے سے پہلے عدالت سے گزارش کروں گا کہ وہ ملزم کے سماجی اور اخلاقی کردار کو نظرانداز نہ کرے ...... اور پرزور درخواست کروں گا کہ قانون کو اس شخص کی عظمت کی حفاظت کرنا ہو گی ......!"

وکیل صفائی کے دلائل نے عدالت میں سناٹا طاری کر دیا ...... سب اس کے بیان سے مرعوب نظر آرہے تھے۔

نوجوان جج! امجد نے اب سرکاری وکیل کی طرف دیکھا۔

"وکیلِ صفائی نے ملزم کی صفائی میں جو دلائل دیئے' سرکاری وکیل کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"جنابِ والا ......" سرکاری وکیل گویا منتظر تھا ...... "میرے دوست وکیل صفائی نے ملزم کی صفائی میں جو کچھ کہا ...... وہ دلائل نہیں ملزم کے حق میں ایسی

جذباتی اپیل تھی، جس سے قانون کی تسلی نہیں ہو سکتی۔ مانا کہ ملزم نے ایک بے کس لڑکی کی عزت کے لئے باپ کا خون کیا لیکن یہ گناہ اور عذر گناہ کی ایک بد ترین مثال ہے .... قانون کبھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ جرم قابل دست اندازی پولیس کے فیصلے گھروں میں کئے جائیں اور اپنی مرضی سے کئے جائیں اور پھر کہا جائے کہ یہی آخری اور سچا اقدام تھا۔ جرم کے بعد اس سے بڑا جرم .... !

"جناب والا .... یہ تو قانون سے کھیلنے کے مترادف ہوا .... میرے معزز دوست وکیل صفائی نے سارا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ انکا مؤکل ایک ایسا شریف آدمی ہے جو زندگی کو قدریں، معاشرے کو مثالیں اور انسانیت کو تکمیل انسانیت کے درس دیتا ہے.....

"جناب والا .... میں اس کی پُر زور تردید کرتا ہوں .... میں سمجھتا ہوں، معاشرہ اس تنظیم کا نام ہے، جس میں انسان، شرافت خوداری اور عزت نفس کے ساتھ زندہ رہ سکے .... زندگی کی قدریں، ہمیں سبق سکھاتی ہیں کہ انسان ہمیشہ سچ کا ساتھ دے .... تہذیب کے معنی میرے نزدیک یہ ہیں کہ زندگی کو ہر پہلو سے خوبصورت بنایا جائے اور ترقی کے معنی یہ ہیں کہ دنیا سے جرائم کا خاتمہ ہو جائے لیکن .... ملزم عدیم جو پڑھا لکھا ہے، انسانیت کا نمونہ ہے۔ ایک چھوٹے جرم کے نتیجے میں ایک بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ معاشرے میں شر کی بنیاد رکھتا ہے، تہذیب کے دامن پر خون کے چھینٹے پھینکتا ہے اور قانون کی دھجیاں اڑاتا ہے مگر سمجھتا ہے کہ وہ سچائی کے لئے سینہ سپر ہے.....

"جناب والا! .... یہی نہیں، میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ قتل کسی انسانی نقطۂ نگاہ کو زندہ رکھنے کے لئے نہیں کیا گیا .... اگر سرتل کی جگہ کسی اور لڑکی کی عزت لٹتی تو ملزم کا رویہ بالکل مختلف ہوتا۔ وہ باپ کو قتل کرنے کی بجائے باپ کو بچانے کی کوشش کرتا .... لیکن سرتل تو وہ لڑکی تھی، جس سے ملزم ٹوٹ کر محبت

کرتا ہے تھا بلکہ شادی کرنا چاہتا تھا .... بد قسمتی کہ باپ نے پہل کر دی اور ملزم کے رومانی تصورات کا شیش محل چور چور ہو کر رہ گیا۔ وہ سب کچھ بھول گیا۔ معاشرہ، تہذیب، قدریں، منہ دیکھتی رہ گئیں اور ایک چھوٹے سے ذاتی جذبے نے قتل جیسا گھناؤنا جرم کر ڈالا ....،

"جناب والا .... یہ قتل محض ذاتی محرومیوں کے احساس کا رد عمل ہے .... اور پھر یہ تصویر کا ایک رخ ہے، دوسرا رخ ملاحظہ فرمایئے۔ اٹھائیس برس گزر گئے .... عدالت نے ملزم کو باعزت طور پر بری کر دیا تھا .... اس وقت ملزم کی عمر لگ بھگ پچاس برس ہے .... میں پوچھتا ہوں، دنیا کا کونسا قانون ہے جو ایک قاتل کو اٹھائیس برس جینے کا حق بخشتا ہے ....؟

"مانا کہ اسے یہ حق عدالت سے ملا تھا لیکن اٹھائیس برس بعد کون سی افتاد پڑی کہ ملزم کو اپنے آپ سے انصاف کی ضرورت پڑ گئی .... جرم جس خواہش کے لئے کیا جاتا ہے، اس خواہش کو کچل دینے کا نام سزا ہے۔ جس امید کے لئے کیا جاتا ہے، اس امید کا گلا گھونٹ دینے کا نام سزا ہے .... لیکن جو شخص زندگی کی تمنائیں اور مقصد حاصل کرنے کے بعد عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو کر کہتا ہے مجھے گولی مار دو، مجھے پھانسی چڑھا دو .... بتایئے، قانون ایسے شخص کو کیا سزا دے سکتا ہے؟

"کسی لاش کو پھانسی چڑھانے سے پھانسی چڑھنے کا مقصد پورا ہو سکتا ہے جناب والا ....؟

"شاید ہو سکتا ہو .... شاید نہ ہو سکتا ہو .... پھر بھی میں اپنا بیان ختم کرنے سے پہلے اتنا ضرور کہوں گا کہ اس شخص کو یا اس لاش کو سوسائٹی میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں .... جو قانون کو کئی بار چکمہ دے چکا ہے اور جو اٹھائیس برس سے غیر قانونی طور پر اس زمین پر دندنا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں انصاف

حاصل کرنے آیا ہوں!"

سرکاری وکیل کے دلائل اس قدر واضح اور ٹھوس تھے کہ اب عدالت میں وکیل صفائی کا جادو ٹوٹتا نظر آ رہا تھا۔

جن لوگوں کی ہمدردیاں ملزم کے ساتھ تھیں' وہ بھی ایک حد تک پریشان ہو گئے تھے ...... واحد ملزم ایک ایسا شخص تھا جس کے چہرے پر موجودہ صورتِ حال کا کوئی تاثر نہیں تھا ...... وہ حسب معمول مطمئن کھڑا تھا۔

جج نے اب اس کی طرف دیکھا۔

"وکیلِ صفائی اور وکیل استغاثہ کی بحث سننے کے بعد ملزم نے کچھ کہنا ہو تو اسے اجازت دی جاتی ہے۔

"جناب والا ......" عدیم نہایت اطمینان اور ٹھہراؤ سے بولا ...... "وکیلِ صفائی کی بحث سن کر میں اپنے آپ کو بے گناہ سمجھنے لگ گیا تھا ...... لیکن وکیل استغاثہ کے دلائل نے خود مجھے اپنی نظروں میں حقیر بنا دیا ہے۔ اس کے باوجود اگر میں ان کے دلائل کی تردید کروں تو اسے میری دیدہ دلیری سمجھ لیجئے ......'

"جنابِ والا ...... اپنے آپ کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے نہ میں داد لینے آیا ہوں اور نہ داد خریدنے ...... اور نہ رہائی کی آس لے کر ...... بلکہ یہ بھی اُن ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری ہے جو میرے ماضی کے ہر صفحے پر درج ہیں ...... اور جو میں نے انجام سے بے نیاز ہو کر کی ہیں......

"میں نے اچھا کیا یا برا' یہ فیصلہ کر سکتا تو عدالت میں ہرگز نہ آتا...... ایک لڑکی کی عزت لوٹی گئی' مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے باپ کو قتل کر دیا لیکن رقیب سمجھ کر نہیں' جیسا کہ وکیلِ استغاثہ نے کہا ہے بلکہ فرض سمجھ کر قتل کیا' کیونکہ میرے نزدیک کبھی قتل بھی فرض کی طرح ضروری ہو جاتا ہے......

"جناب والا ...... وکیلِ استغاثہ نے سارا زور اس پر صرف کیا ہے کہ جب

قانون میں عصمت دری کے لئے واضح دفعات موجود ہیں تو میں نے قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کیوں کی ہے ......؟

"بے شک' آپ کا قانون عزت لوٹنے کی سزا دیتا ہے لیکن وہ احساس جو عزت لٹنے کے ساتھ لٹ جاتا ہے' قانون اس کا صلہ کس طرح دے سکتا ہے......؟ مانا کہ عصمت لٹنے کی دفعہ آپ کی کتابوں میں موجود ہے لیکن اس احساس کے لٹ جانے کا آپ کی کتابوں میں کوئی دفعہ نہیں ہے' جس سے ایک مشرقی لڑکی جھولنے سے لے کر جوانی تک سرشار رہتی ہے ...... افسوس ہے ...... ہمارا قانون ایک ایسے شخص کے قتل کو قتل عمد کہتا ہے جو زندگی کے ہر جذبے اور احساس سے خالی ہو چکا تھا ...... جو لوہار کی دھونکنی کی طرح سانس تو لیتا تھا ...... لیکن زندگی کے نور سے خالی تھا......'

"میں پوچھتا ہوں ...... آپ کا قانون کیا ہے ......؟ آپ سیٹھ داؤد کی طرح متعفن لاشوں کو سوسائٹی میں زندہ رہنے کا حق کیونکر دیتے ہیں ......؟ آپ چوروں اور ڈاکوؤں کو روپیہ لوٹنے پر سزا دیتے ہیں لیکن احساس جیسے نازک آبگینوں کو توڑنے والوں کے قتل کو قتل عمد کہتے ہیں......

"ٹھیک ہے ...... کسی کی روح کو کچل دو' بے چارہ قانون بے بس ہے۔ احساس کا گلا گھونٹ دو' قانون لاچار ہے ...... لیکن کسی لاش کو گولی مار کر جہنم رسید کردو تو قانون کی رگِ حمیت پھڑک اٹھتی ہے۔ جنابِ والا ...... میں قتل کا اقرار کرتا ہوں اور اگر میرا بس چلے تو میں سیٹھ داؤد جیسے لوگوں کا قتل عام جاری رکھوں'......

"جنابِ والا' مجھے اس قتل پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ بس افسوس ہے تو اس بات کا کہ قاتل ہونے کے باوجود مجھے شک کا فائدہ دے کر باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔ مجھے باعزت بری ہونے پر اعتراض نہیں ہے ...... مجھے معزز عدالت کے فیصلے کا بھی احترام ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میری باعزت رہائی کی وجہ سرتل کا اقبال

جرم تھا ......!' نہ وہ اقرار کرتی اور نہ ہمیں شک کا فائدہ دے کر بری کیا جاتا ......
جناب والا ...... میں اپنے طور پر انصاف چاہتا تھا۔ قید' رہائی یا پھانسی...... جو بھی ہوتا
میں اصل واقعات کی روشنی میں انصاف چاہتا تھا......

"میرا عدالتِ عالیہ تک دوبارہ پہنچنے کا مقصد بھی یہی ہے ...... اٹھائیس
برس بعد سہی۔ میں آ تو گیا ہوں' عدالت کی دہلیز پر ......!' بے شک' کسی قاتل کو زندہ
رہنے کا حق نہیں پہنچتا۔ لیکن اگر زندہ رہنے کی بجائے کسی کو زندہ رکھنے کا فرض
کندھوں پر آن پڑے تو اس فرض کو تمنا' خواہش اور امید کا نام کیوں دیا جائے ......
اور بفرض محال تھوڑی دیر کے لئے اسے امید بھی کہہ دیا جائے تو کیا کوئی شخص مجھے
بتا سکتا ہے کہ امیدیں بر آنے کے بعد انسان کو زندگی سے پیار نہیں رہتا ......'

"جنابِ والا ...... یہ ضرور سنتے آئے ہیں کہ کسی شخص نے مایوسیوں'
محرومیوں اور نامرادیوں سے گھبرا کر خودکشی کر لی ہے ...... لیکن آج تک کسی نے یہ
نہ سنا ہو گا کہ کسی شخص نے کامرانیوں اور شادکامیوں کی منزل پر پہنچ کر خودکشی کر لی
ہے ......'

"غور فرمایا جائے' جناب والا ...... میری زندگی میں دونوں مرحلے آئے'
نامرادی کا بھی' کامرانی کا بھی' مگر نہ تو میں نے زندگی کے بدترین لمحوں میں خودکشی
کے لئے سوچا اور نہ تکمیل فرض کے بعد مرنے کے لئے ...... میں تو عدالت کے
کٹہرے میں اس لئے کھڑا ہوں کہ یہ بھی دوسرے فرائض کی طرح ایک اہم فرض
تھا ...... اس فرض کو پورا کرنے کے بعد اب ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں رہا ......'

"جنابِ والا ...... میں بیان ختم کرنے سے پہلے وکیلِ استغاثہ سے ایک
بات تحقیق سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ زندگی کسی لمحے بھی مقصد سے خالی نہیں ہوتی
...... اس وقت بھی جب کہ میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں ، انصاف کا مقصد
لے کر کھڑا ہوں۔' میں نے قتل کیا ہے۔ میں نے وقتی طور پر اس قتل پر پردہ بھی ڈالا

ہے۔ مجھے اس کی سزا بھی ملنی چاہئے لیکن خدارا میری نیت پر شبہ نہ کیجئے ......
میری نیک نیتی سے انکار خدا سے انکار کے مترادف ہو گا!!"

حسبِ معمول عدالت میں ایک بار پھر سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ ان تینوں کے
دلائل اپنی اپنی جگہ اس قدر مکمل تھے کہ اگر ایک کے بعد دوسرا بیان نہ آتا تو آدمی
پہلے ہی بیان کو سچ مانتا' کیونکہ ایک حد تک یہ تینوں سچ کہہ رہے تھے اور نہایت
خوبصورتی سے کہہ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں ...... ایک طرح سے سب
بے تاب تھے کہ اس انوکھے مقدمے کا انجام کیا ہوتا ہے---- لیکن ایک بات واضح
تھی کہ اکثر حاضرینِ عدالت کی ہمدردیاں ملزم کے ساتھ تھیں اور یہ بات ان کی
آنکھوں سے عیاں تھی ...... مگر قانون کی موشگافیاں اپنی جگہ تھیں۔ کوئی نہیں جانتا
تھا کہ ملزم جس طرح کے انصاف کا طالب ہے اس کی شکل کیا ہو گی ......؟

سرگوشیاں کچھ اور زیادہ بڑھیں تو جج نے ہتھوڑا اٹھا کر دو تین بار میز پر
مارا۔ عدالت میں خاموشی چھا گئی اور سب کی نظریں احتراماً" جج پر مرکوز ہو گئیں ......

جج نے ملزم کی طرف دیکھا۔

"وکلاء کی بحث اور ملزم کا بیان سننے کے بعد ایک نیا سوال سامنے آیا ہے۔
وہ یہ کہ اس نوجوان کو عدالت میں پیش کیا جائے' جسے ملزم عدیم نے پروان چڑھایا
ہے۔ جو کہانی ملزم نے سنائی ہے' اس کی تصدیق کے لئے اس کا بیان ضروری ہے!"

عدیم نے احترام سے کہا۔

"میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ اس کے لئے مجھے مجبور نہ کیا
جائے"۔

جج نے قدرے سختی سے کہا۔

"عدالت کسی مصلحت کو انصاف کے ترازو سے اونچا نہیں سمجھتی"۔

عدیم نے جج کے لہجے کی سختی کو محسوس کر کے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"میں زندگی کی آن کو ہر چیز سے بالاتر سمجھتا ہوں!"

جج نے اس سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کا ذاتی نظریہ ہے' قانون کا قاعدہ کلیہ بہر صورت مقدم ہے"۔

"ہو گا جناب والا .... لیکن میں زندگی کی ننگی لاش سے شرافت کی چادر نہیں اتار سکتا ...."

جج کو غالباً" عدیم کی بات اچھی نہ لگی .... اس لئے اس نے زور دے کر کہا۔

"عدالت آپ کو مجبور کر سکتی ہے .... !"

"عدالت مجھے کبھی مجبور نہیں پائے گی .... عدالت مجھے قید کر سکتی ہے، عدالت مجھے پھانسی چڑھا سکتی ہے لیکن عدالت مجھے کبھی اپنے اصولوں سے ہٹا نہیں سکے گی!"

"یعنی آپ انکار کرتے ہیں ....؟" جج نے حیرت اور غصے سے پوچھا۔

"جناب والا ......" عدیم نے اسے دلیل سے قائل کرنا چاہا ...... "زندگی کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ جس طرح کپڑے اتار کر میں عدالت میں ننگا نہیں آ سکتا اسی طرح زندگی کو بھی بے پردہ اور بے آبرو نہیں دیکھ سکتا!"

مگر جج نے اس سے اتفاق نہ کیا۔

"تو عدالت یہ سمجھنے پر مجبور ہو گی کہ آپ نے جو کہانی بیان کی ہے' غلط ہے اور محض افسانہ ہے!"

مگر عین اس لمحے مالی بابا شیروانی پہنے کورٹ میں داخل ہوا اور اس نے جج کی بات کاٹی ....

"افسانہ کیسے جج صاحب' یہ کھلی حقیقت ہے!"

جج نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ابا حضور .... !"

مالی بابا جوشیلے لہجے میں بولا۔

"کیوں اس شریف آدمی کا افسانہ بناتے ہو؟ کیوں اس کا مذاق اڑاتے ہو اور کیوں اس کے اصولوں سے ٹکراتے ہو .... ؟"

جج کو بھی غصہ آ گیا۔

"یہ گھر نہیں عدالت ہے ابا حضور"۔

"کون سا گھر اور کون سی عدالت .... !" مالی بابا کا جوش کم نہ ہوا .... جس گھر کا تم ذکر کر رہے ہو' وہ بھی اسی شخص کا دیا ہوا ہے اور جس عدالت کا ذکر کر رہے ہو' اس کی کرسی بھی تمہیں اسی شخص کی کوششوں سے ملی ہے .... !"

اب جج کے بجائے عدیم نے احتجاج کیا ....

"کرم دین بابا .... !"

"مالی بابا کہو عدیم صاحب"۔ اس نے عدیم کی طرف دیکھا ...... "مجھے نوجوان جج کو بتا لینے دو کہ اگر وہ زندگی کے وقار کو بے نقاب دیکھنا ہی چاہتا ہے تو میں اس کی تسلی ضرور کروں گا .... مجھے یہ بتا دینے میں کوئی عار نہیں کہ میں اس کا باپ نہیں۔ عدیم صاحب کا وہ غریب مالی ہوں' جس کا ذکر اس افسانے میں بار بار آیا ہے .... میں جج صاحب کا باپ نہیں' اس معصوم لڑکی کا باپ ہوں جو اس کہانی میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے .... اور محترم جج صاحب' آپ میرے بیٹے نہیں' اسی معصوم لڑکی کے بیٹے ہیں!!"

جج تقریباً" چیخ اٹھا۔

"خاموش .... !"

"خاموشی کیسی جج صاحب"۔ مالی بابا کا جوش ہر لحظہ بڑھ رہا تھا .... "وہ

نوجوان آپ ہی ہیں۔ جو عدالت کو عدیم صاحب کے بیان کی تصدیق کے لئے مطلوب
ہے .... وہ آپ ہی ہیں جج صاحب' جسے عدیم صاحب نے پالا پوسا تعلیم دلائی اور
پروان چڑھایا اور اپنی ساری جائداد آپ کے نام لکھ دی لیکن میرے سوا کسی کو اس
کی خبر نہ ہونے دی .... میں کہتا ہوں' وہ کون سا اخلاقی پہلو ہو گا جو اس شخص کے
کردار کی نفی کرے گا .... وہ کون سا قانون ہو گا جو اس فرشتے کو سزا دے سکے گا
........؟ لیکن اگر تمہارا قانون بے بس ہے' کچھ نہیں کر سکتا تو اسے بدل ڈالو۔ قانون
بدل سکتا ہے مگر ایسا آدمی دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتا!"

نوجوان جج کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ وہ اس صورت حال سے ایک حد تک گھبرا
گیا تھا مگر اس لمحے عدیم نے پھر مداخلت کی۔

"بابا .... مجھے زندگی نہیں انصاف چاہئے انصاف ....اس انصاف کی شکل
کس طرح ہو گی' میں نہیں جانتا .... مگر میں یہاں اس لئے نہیں آیا تھا کہ زندگی
کی بھیک مانگوں یا قانون کو امتحان میں ڈالوں ....

"جناب والا .... مجھے ناموری سے غرض ہے اور نہ شہرت سے .... مجھے
کسی قسم کی سفارش کی ضرورت نہیں .... میں ضمیر کی پکار پر یہاں آیا ہوں ....
اس پکار کو ایک پلڑے میں ڈال دو اور قانون کو دوسرے پلڑے میں .... میں قاتل
ہوں، مجھے پھانسی دو یا رہا کرو .... لیکن میں ساری زندگی اپنے ضمیر کی قید میں نہیں
رہ سکتا، مجھے آزادی چاہئے .... آزادی' روح کی آزادی !!!"

اس انکشاف سے عدالت کا ماحول یکسر بدل گیا ...... وکلاء تک انگشت بدنداں
تھے اور حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ کوئی بھی یہ توقع نہیں کرتا تھ
کہ جج جو انصاف کی کرسی پر بیٹھا ہے' قانوناً" اس کرسی پر بیٹھنے کا مجاز بھی ہے یا نہیں
عدیم جو اس راز کو افشا کرنے سے احتراز کر رہا تھا' کیا اپنے رویئے میں حق
بجانب تھا ....؟ یا یہ کہ وہ ایک غیر قانونی وجود کو تحفظ دے کر کسی اور جرم

ارتقاب کر رہا تھا؟

بہت سی باتیں تھیں' بہت سے سوال تھے جو ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے تھے
اور فوری طور پر ان کا جواب تلاش کرنا مشکل تھا ....

غالباً" نوجوان جج کو بھی یہی صورت حال درپیش تھی .... یہی وجہ تھی کہ
اس نے نہایت کمزور آواز میں ایک ہفتے کے لئے مقدمے کو ملتوی کرنے کا اعلان کیا
اور عدالت برخواست کر دی۔

۵۵

نوجوان جج کسی نہ کسی طرح گھر تو پہنچ گیا تھا مگر اب کیفیت یہ تھی جیسے سکتہ ہو گیا ہو اُسے۔

وہ بستر میں نیم دراز سوچوں میں مستغرق تھا اور ٹکٹکی لگائے سامنے کی دیوار کو چھید جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

ان کا فیملی ڈاکٹر جسے سارے پس منظر سے آگاہ کر دیا گیا تھا' اس کی حالت دیکھ کر سخت پریشان تھا۔ اس نے نہ صرف امجد کو دل کو تقویت پہنچانے والے ٹیکے لگائے بلکہ دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ بیوی بچے اور گھر کے حوالے دیتا رہا۔ زندگی اور مستقبل کی باتیں کرتا رہا۔

مگر نوجوان جج خاموش تھا ...... اس کی خاموشی اتنی گمبھیر اور گہری تھی کہ ڈاکٹر بھی ایک [illegible] تک خوف زدہ ہو گیا تھا۔ وہ اس سکوت کے معنی سمجھتا تھا۔

جو طوفان آنے والا تھا' وہ اس سے مخفی نہ تھا۔

[illegible] نوجوان جج کی خوبصورت بیوی شائستہ اپنے تین سال کے بچے کو سینے سے

لگائے پریشان بیٹھی تھی ...... وہ ڈاکٹر کی منتظر تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا شاد و آباد گھر برباد ہونے والا تھا۔

معاً دروازہ کھلا ...... ڈاکٹر امجد کے کمرے سے باہر نکلا ...... شائستہ لپک کر اس کی طرف بڑھی اور بے تابی سے بولی۔

"ڈاکٹر صاحب ...... !"

ڈاکٹر چند لمحے خاموش رہا ...... جیسے سوچ رہا ہو کہ امجد کی بیوی کو کس طرح سے مطمئن کیا جائے ......؟

شائستہ ڈاکٹر کی خاموشی سے گھبرا کر بولی۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب ......؟"

ڈاکٹر دھیمے لہجے میں بولا ......

"انہیں بہت گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ ہم سب کوشش کریں گے کہ وہ یہ صدمہ بھول جائیں"۔

شائستہ نے مضطربانہ پوچھا۔

"ڈاکٹر' ان کی زندگی خطرے میں تو نہیں"۔

"ہے بھی' نہیں بھی!" ڈاکٹر نے جواب دیا ...... "اگر صدمہ ان کے دل و دماغ سے نکل گیا تو بچ جائیں گے اور اگر اس کا اثر ان کے ذہن میں رہا تو ان کی زندگی ہر لمحے خطرے میں ہو گی"۔

شائستہ اور زیادہ پریشان ہو گئی۔

"یہ خطرہ کیسے دور ہو گا ڈاکٹر؟ کس طرح یہ صدمہ ان کے دل و دماغ سے نکلے گا؟"

"آپ یہ کام کر سکتی ہیں۔ آپ کا معصوم بچہ یہ کام کر سکتا ہے۔ آپ کا مستقبل آپ کے بچے کا مستقبل' یہ سب باتیں ان کو زندگی کی شاہراہ پر واپس لا سکتی

ہیں"۔

"مجھے ہر قدم پر آپ کی مدد کی ضرورت ہو گی ڈاکٹر"۔

"میں ہر قدم پر آپ کے ساتھ ہوں گا"۔ ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"میں نہ صرف آپ کا فیملی ڈاکٹر ہوں بلکہ جج صاحب کا دوست بھی ہوں۔ ان کی زندگی میرے لئے بھی اتنی ہی قیمتی ہے، جتنی آپ کے لئے"۔

شائستہ نے ایک اور شک کا اظہار کیا۔

"مگر ان کے ذہن سے یہ احساس کس طرح دور ہو گا کہ وہ نا جائز اولاد ہے؟"

"یہی تو مشکل کام ہے شائستہ بہن، یہی تو مسئلہ ہے .... مگر ہم ہمت نہیں ہاریں گے اگر جج صاحب مر گئے تو ایک پورا دور مر جائے گا۔ اُس عظیم شخص کی قربانی مر جائے گی، جس نے زندگی کے پچاس قیمتی برس امجد کو پہنچنے کے لئے وقف کر دیئے تھے ...."

شائستہ جذباتی ہو گئی ....

"ڈاکٹر صاحب ....!"

ڈاکٹر نے مزید تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہمت نہ ہاریں بہن، جائیے ...... اس کا سامنا کیجئے۔ اس میں جینے کی امنگ پیدا کیجئے .... اسے سمجھائیے کہ زندگی بار بار نہیں ملتی --- جائیے اندر جائیے۔ - - - - - اس کے دکھے دل پر مرہم رکھیئے۔ اس کے زخموں پر پھاہا رکھیئے۔ اس کو جینے پر مجبور کیجئے ....!"

...... شائستہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں ...... ڈاکٹر کی باتوں سے اس کی ڈھارس بندھ گئی ...... وہ اپنے آپ کو سرشار اور توانا محسوس کرنے لگی۔ وفور جذبات سے اس کا دل بھر آیا۔

ڈاکٹر نے اُس کی کیفیت کو محسوس کیا تو مسکرا کر بولا۔

"جائیے دیر نہ کریں ...... ہر ہر لمحے کا سودا کرنا ہو گا۔ ہر ہر لمحہ اپنانا ہو گا۔ اسے موقع نہ دیجئے کہ کمزوری کا کوئی لمحہ اسے ہم سے چھین کر لے جائے!"

شائستہ امیدوں بھرا دل لے کر اندر چلی گئی۔

امجد حسبِ معمول دیوار کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا...... شائستہ ہولے ہولے آگے بڑھی اور اس کے سامنے خاموشی سے کھڑی ہو گئی ...... امجد شائستہ کو دیکھ کر چونکا اور اس کی آنکھوں میں دکھ کے سائے پھیل گئے۔

چند لمحے خاموشی سے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

شائستہ کی آنکھوں میں پیار ہی پیار تھا ...... پیار ہی پیار ......!

ایک وفا شعار بیاہتا کی مکمل فرماں برداریاں۔

مگر امجد کا زخمی دل ان حقیقتوں کو نہ پا سکا ...... اس کی دُکھی روح کوئے ملامت میں بھٹک رہی تھی اور......

وہ پلک جھپکتے میں دنیا سے کٹ گیا تھا......!

شائستہ نے دیکھا کہ امجد ایک بت ہے جو جذبے اور احساس سے خالی ہو چکا ہے۔ جو بیوی اور بچے کی محبت بھی بھول چکا ہے تو وہ تلملا اٹھی اور بے ساختہ اس سے لپٹ گئی۔

امجد نے بیوی کی وارفتگی کو پوری طرح محسوس کیا مگر تہذیبی سفر نے اسے جس پگڈنڈی پر لا کھڑا کیا تھا، آگے اس کے نشان معدوم تھے اور وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ سفر ختم ہو چکا ہے۔

شائستہ کے دکھ کو بھی اس نے احساسِ محرومی کا مفہوم دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی صفائی پیش کی۔

"مجھے افسوس ہے شائستہ، میں نے آپ کی زندگی تباہ کر دی۔ آپ کا مستقبل

خراب کر دیا ......"

مگر شائستہ نے ایک دعوے سے سر اٹھایا ......

"کون کہتا ہے کہ میرا مستقبل خراب ہوا اور کون کہتا ہے کہ میری زندگی تباہ ہوئی؟"

لیکن امجد کے لہجے میں وہی دکھ اور تلخی تھی۔

"اگر میں جانتا کہ میں ایک حقیر کیڑا ہوں۔ میرا ماضی اتنا گھناؤنا ہے تو کبھی تم سے محبت نہ کرتا۔ کبھی تم سے شادی کی جسارت نہ کرتا اور نہ کبھی تمہارے حسین خوابوں کو مٹی میں ملاتا۔"

"امجد ......!" شائستہ یقین افروز لہجے میں بولی۔ "میں اپنی زندگی سے مایوس نہیں ہوں اور نہ اپنے مستقبل سے خائف ہوں، نہ آپ کے ماضی پر اعتراض کرتی ہوں اور نہ آپ کو ادنیٰ سمجھتی ہوں، نہ میرے خواب بکھرے ہیں اور نہ میں اپنے خواب بکھرنے دوں گی ......!"

"شائستہ ......!" امجد کے لہجے میں مایوسی تھی ...... "میں ناجائز اولاد ہوں۔ ناجائز اولاد کو اس سماج میں جینے کا حق نہیں ہوتا۔"

"کیوں نہیں ہوتا اگر ناجائز اولاد کا گلا گھونٹ دینا قانونی جرم ہے تو اس کے صاف معنی ہیں کہ اسے جینے کا حق ہے"۔ "یہ قانونی حق ہے۔ اخلاق اور معاشرہ اسے نہیں مانتا۔"

"ہم معاشرے سے بھی یہ حق منوالیں گے۔ اگر ہم زندگی پر بوجھ نہیں بنتے۔ اگر ہم اس قابل ہوں گے کہ معاشرے کے حسن میں اضافہ کر سکیں تو معاشرہ ہمیں خود بخود آنکھوں میں بٹھائے گا۔"

"شائستہ ......!" امجد نے فرار کا ایک تہذیبی سہارا لیا......

"اگر اس معاشرہ میں ناجائز اولاد کو عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا تو گویا ہم خود

گناہ کو پنپنے کا موقع دیں گے۔ گناہ اور عذر گناہ کی ایک بد ترین مثال قائم کریں گے ...... کل ہر بیٹی اور ہر بہن کی گود میں ایک ناجائز بچہ ہو گا اور کل ہر مرد درندہ بن کر زندگی کی عظمتیں لوٹے گا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سوسائٹی اور زندگی کے تقدس کی خاطر اپنی زندگی قربان کر دوں ......!"

"ایسا ہرگز نہیں ہو گا" ......! شائستہ اپنی جگہ اٹل تھی ...... "آپ کو جینا ہو گا امجد' آپ کو جینا ہو گا ...... آپ نے ایک شریف بیوی سے زندگی نبھانے کا عہد کیا تھا ...... آپ کے مرجانے سے سماج کا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن ایک محبت کرنے والی بیوی کا سب کچھ لُٹ جائے گا۔"

"شائستہ ......!" امجد اپنے اصول پر اڑا ہوا تھا ...... "یہ زندگی کی آن کا سوال ہے۔ میری موت سے صرف ایک تم برباد ہو گی مگر سارے سماج کو سبق ملے گا کہ جینا اتنا ضروری نہیں ہوتا' جتنا آن کے لئے مرنا ضروری ہوتا ہے!"

مگر شائستہ نے اس کی بات رد کردی ......

"میں اس کے بالکل الٹ کہتی ہوں امجد' کہ مرنا تو بہت آسان کام ہوتا ہے' جینے کی شان یہ ہے کہ انسان مر مر کر جیئے۔ آندھی آئے طوفان آئے مگر چٹان کی طرح ڈٹا رہے ...... موت کی آغوش میں پناہ لینا زندگی کی شان نہیں' بزدلوں کا شیوہ ہوتا ہے!"

"شائستہ ......!" امجد ایک طرح سے لاجواب ہو کر چلّایا۔

مگر شائستہ نے کوئی پروا نہ کی ......

"ایک بار نہیں سو بار کہوں گی کہ اگر آپ بزدلوں کی طرح مرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اختیار ہے لیکن ایک بات یاد رکھیئے کہ آپ ایک معصوم بچے کے باپ ہیں ...... کل یہ بچہ جوان ہو جائے گا۔ جب اسے معلوم ہو گا کہ اس کا باپ کون تھا اور کس طرح مرا تھا تو بتایئے اس کے دل پر کیا گزرے گی ......؟ کیا وہ بھی آپ کی

طرح خودکشی کے لئے نہیں سوچے گا ......؟ کیا خودکشی اس خاندان کے لئے روایت نہ بن جائے گی ......؟؟؟"

نوجوان جج روانکھا سا ہو گیا۔ اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

"شائستہ ...... مجھے تو زندگی نے پہلے ہی لاجواب کر دیا ہے۔ تم بھی مجھے لاجواب کر دینے پر تُل گئی ہو...... کیوں مجھے ستاتی ہو، کیوں جینے کی جھوٹی آس دلاتی ہو ......؟"

وہ روتے ہوئے اٹھا اور دیوار سے منہ لگا کر زار و قطار رونے لگ گیا ......

شائستہ بھی اٹھی ...... اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

"سوچئے امجد ...... ہمارا بچہ ناجائز اولاد نہیں ہے۔ وہ معصوم ہے، بے گناہ ہے ...... آپ کا خون ہے۔ آپ کی زندگی ہے اور زندگی بار بار نہیں ملتی سرتاج ...... دکھوں کا مقابلہ کیجئے۔ دکھوں سے ہارنے کا مطلب تو یہ ہو گا کہ آج آپ ہار جائیں گے، کل آپ کا بیٹا ہار جائے گا!"

امجد نے پلٹ کر بیوی کو بھیگی بھیگی آنکھوں سے دیکھا......

شائستہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں ...... اور بے حد نرمی اور پیار سے بولی۔

"سرتاج ...... کوئی خون افضل نہیں ہوتا۔ کوئی خون حقیر نہیں ہوتا۔ سب انسان مٹی کے پتلے ہوتے ہیں۔ یہ پتلا کبھی نیکی کی شاہراہ پر چلتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی بدی کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اچھوں کے گھر برے اور بروں کے گھر اچھے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اصل چیز کردار ہوتا ہے۔ کردار اچھا ہو تو ساری زندگی حسین ہو جاتی ہے۔"

نوجوان جج متاثر ہو چکا تھا ...... اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے لرزتے

ہاتھوں سے بیوی کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور بھاری آواز میں بولا۔

"شائستہ ......!"

"سرتاج ......!" شائستہ نے اسی گمبھیر لہجے میں جواب دیا ...... "آپ مر گئے تو ایک پورا دور مرجائے گا ...... وہ عظیم شخص مرجائے گا، جس نے آپ کو پروان چڑھانے کے لئے زندگی کے پچاس برسوں کا ایک ایک لمحہ سولی پر گزارا ہے"۔

امجد جذباتی ہو کر ہونٹ کاٹنے لگ گیا۔

"تم کتنی اچھی ہو شائستہ!"

شائستہ جو خود بھی شوہر کی کیفیت سے متاثر ہو کر گمبھیر ہو گئی تھی اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی!

"آج ہی استعفیٰ دے دیجئے۔ قانون کو کھنگالیئے ...... عدیم صاحب کا مقدمہ لڑیئے ...... پھر دیکھیے، آپ کی زندگی کتنی با مقصد ہوتی ہے!"

"ہاں ہاں ......!" وہ رو پڑا۔ اس نے بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں لڑوں گا، میں عدیم صاحب کا مقدمہ لڑوں گا!!"

اب اس نے بیوی کے کندھے سے سر اٹھایا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

"میں لڑوں گا، شائستہ ...... میں ایسا مقدمہ لڑوں گا کہ قانون کی تاریخ میں یادگار بن جائے گا۔ لوگوں کے لئے مثال بن جائے گی کہ جو انسان اس زمین پر جنم لیتا ہے، ایک ہزار مقصد ساتھ لے کر وجود میں آتا ہے ......!"

خاوند کا نیا روپ دیکھ کر شائستہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے۔

عین اس لمحے ان کا بچہ ابو ابو پکارتا ہوا اندر آگیا ...... امجد دیوانوں کی طرح لپکا ...... اور بچے کو گود میں لے کر اس طرح سینے سے چمٹا لیا، جیسے ہزاروں سال کے بچھڑے ہوئے ملے ہوں۔

شائستہ حیرت و حسرت سے آنسو پی رہی تھی اور ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

ہاں ...... وہ جانتی تھی
کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے ......!"

۵۵

آج عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی ......

سابق جج امجد وکیل کے لباس میں چپ چاپ کھڑا تھا اور اس کی جگہ کرسیٔ عدالت پر ایک بھاری بھرکم جج بیٹھا سرکاری وکیل کی بحث سن رہا تھا۔

"جنابِ والا ! مقدمہ کی ساری کاروائی کے ایک ایک جز سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ صاف قتلِ عمد کا کیس ہے ...... میں پوچھتا ہوں' کیا یہ واقعہ نہیں کہ سیٹھ داؤد قتل ہوئے ہیں ......؟"

"جنابِ والا ...... یہ بالکل واقعہ ہے کہ سیٹھ داؤد قتل ہوئے ہیں ......" امجد نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا ...... "ہم اس قتل کا اقرار کرتے ہیں لیکن یہ قتل کیسے ہوا ہے' عدالت اچھی طرح جانتی ہے۔ اشتعال میں آکر تو لوگ معمولی معمولی باتوں پر قتل کر دیتے ہیں ...... یہاں تو ایک کنواری لڑکی کی عزت کا سوال تھا ...... ظاہر ہے کہ فوری اشتعال کے نتیجے میں جرم کی نوعیت بدل جاتی ہے اور جرم'

جرم نہیں رہتا ......"

"جنابِ والا ....." سرکاری وکیل نے بات جاری رکھی .... "کچھ بھی ہو۔ قتل، قتل ہوتا ہے۔ خون، خون ہوتا ہے۔ خون بادشاہ کا گرے یا غریب کا، باپ کا گرے یا بھائی کا .... قاتل غیر ہو یا بیٹا ہو، آخر قاتل ہی ہوتا ہے .... جرم تو جرم ہی ہوتا ہے۔ اور یہاں تو دلچسپ بات یہ ہے کہ قاتل خود اقبالِ جرم کرتا ہے۔ اس کے بعد تمام صفائی اور سب دلیلیں بے کار ہو جاتی ہیں ...."

امجد نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے جنابِ والا، یہ ٹھیک ہے کہ ملزم اقبالِ جرم کرتا ہے لیکن یہ اقبالِ جرم دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ باعثِ فخر اور باعثِ عبرت بھی ہے .... لوگ بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ فلاں لڑکی کی عزت لٹ گئی اور عزت لوٹنے والے کو دس سال کی سزا ہو گئی۔ میں کہتا ہوں، ٹھیک ہے، دس سال کی سزا بڑی سزا ہے مگر دیکھا گیا ہے کہ پلک جھپکنے میں دس سال گزر جاتے ہیں۔ دس سال کے بعد یہ شخص معاشرے میں واپس آ جاتا ہے اور پھر چاہے تو شادی بھی رچاتا ہے مگر سماج اس کا بائیکاٹ نہیں کرتا .... کیونکہ یہ سماج ہمارے مردوں کا سماج ہے ......

"لیکن وہ لڑکی، جس کا کوئی قصور نہ تھا۔ جس کی عزت زبردستی لوٹی گئی تھی، اس سماج میں اٹھتی انگلیوں کا نشانہ بن جاتی ہے اور سماج اسے عضوِ معطل کی طرح کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ جنابِ والا ...... نہ صرف اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے بلکہ اس کا مستقبل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سیاہ چادر میں دفن ہو جاتا ہے ....

جنابِ والا .... میں پوچھتا ہوں، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ظلم کرنے والا تو سماج میں دندناتا پھرتا ہے مگر ظلم سہنے والے کو سماج میں منہ چھپانے کو جگہ نہیں ملتی؟

"جنابِ والا ...... میں کہتا ہوں، یہ قانون کی دفعات کے تقدس کا سوال نہیں ہے، یہ انسان کے مستقبل کا سوال ہے اگر آپ کا قانون نرم ہے تو اسے سخت کر

دیجئے اگر آپ کا قانون غلط ہے تو اس کی اصلاح کیجئے ...... ایسا قانون بنایئے کہ روئے زمین پر کسی کی عصمت نہ لٹے .... ورنہ اس زمین سے فساد ختم نہ ہو گا۔ اس معاشرے میں شر ختم نہ ہو گا۔ جنابِ والا .... بنیادوں کو درست کیجئے۔ انسان کا مستقبل خود بخود محفوظ ہو جائے گا .... پھر کوئی ظالم ہو گا اور نہ کوئی مظلوم ہو گا .... کوئی لوٹنے والا ہو گا اور نہ کوئی لٹنے والی ہو گی ......

"جنابِ والا ...... آدمی مرجائے یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان عزتِ نفس کے ساتھ زندہ رہے .... اسی طرح دولت لٹ جائے تو کچھ نہیں لٹتا لیکن عزت لٹ جائے تو سب کچھ لٹ جاتا ہے۔ جنابِ والا ...... مجھے کہنے دیجئے کہ انسان کو وقار کے ساتھ زندہ رکھنا قانون کا فرضِ اولین ہے .... لیکن اگر کوئی قانون انسان کے اس حق کی حفاظت نہیں کر سکتا تو اسے ختم کر دیجئے کیونکہ انسان کا وقار بہرحال قانون کے وقار سے بالا تر ہونا چاہئے!"

مگر سرکاری وکیل نے وکیلِ صفائی کی کسی بات پر کان نہ دھرا۔

"جنابِ والا .... میرے محترم دوست وکیلِ صفائی، قانون سے ہٹ کر جذبات کی باتیں کرنے لگے ہیں ...... وہ ملک کے مروجہ قانون پر تنقید کرتے ہیں۔ کیونکہ اس قانون کے تحت ان کا مؤکل قاتل ثابت ہوتا ہے مگر قانون جذبات کی بجائے حالات اور شواہد کو سامنے رکھ کر فیصلے کرتا ہے .... دیکھا جائے گا، جب نیا معاشرہ جنم لے گا۔ دیکھا جائے گا، جب اصول بدلے جائیں گے۔ دیکھا جائے گا، جب قانون بدلا جائے لیکن اس وقت مقدمہ ملک کے مروجہ قانون کے تحت چل رہا ہے۔ رائج الوقت قانون کا احترام ضروری اور مقدم ہے۔ فیصلہ بھی اسی کے تحت ہو گا!"

جج نے سرکاری وکیل کے دلائل سے اتفاق کیا ......

"درست ہے۔ میں وکیلِ صفائی سے کہوں گا کہ غیر متعلقہ باتوں سے اعتراض کرے"۔

"جنابِ والا ...." امجد اپنے مؤقف پر اڑا رہا .... یہ ایسی باتیں ہیں جو مقدمہ کی روح اور قتل کی بنیادی وجہ سے گہرا واسطہ رکھتی ہیں .... بے شک فیصلہ اسی قانون کے تحت ہو گا مگر میں مقدمہ کے اخلاقی پہلوؤں پر بحث کی اجازت چاہتا ہوں کیونکہ انصاف حاصل کرنے کے لئے ان کا تذکرہ ضروری ہے۔ میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ میرا مؤکل قتل کے اقدام میں حق بجانب تھا ...."

جج نے اس کے مؤقف سے اتفاق کیا۔

"آپ کو اجازت ہے"۔

"جنابِ والا .... امجد نے ولولہ انگیز لہجے میں بحث کو آگے بڑھایا۔ "ایک لڑکی کی عصمت لٹ گئی۔ اس کی باعزت زندگی کا تصور ختم ہو گیا۔ اس کا خاندان اندھیروں میں ڈوب گیا۔ ایک درندہ صفت آدمی کی غلطی سے سارا معاشرہ متاثر ہوا .... جنابِ والا .... میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس کی غلطی، لڑکی کو اپنی آبرو واپس دلا سکتی ہے؟ اس کے خاندان کے وقار کو واپس لا سکتی ہے ....؟

"ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہو گا .... دنیا کی کوئی طاقت اس ظلم کی تلافی نہیں کر سکتی ..... ظالم کو قتل کرنے کے بعد بھی خاندان کا وقار اور لڑکی کی آبرو واپس نہیں آ سکتی .... بلکہ بے حرمتی کا یہ داغ پشت در پشت، نسل در نسل، اس خاندان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ بنا رہے گا .... میں پوچھتا ہوں، کیا ایسے درندے کو قتل کرنا جرم ہے، جس کا زندہ رہنا بجائے خود ایک جرم تھا ....؟

"جنابِ والا .... میں سمجھتا ہوں اور ہر آدمی کو یہ بات سمجھ آ جانی چاہئے کہ ایسے ظالم کو قتل کرنا اس کے لئے بہت معمولی سزا ہے!"

امجد کے دلائل سے عدیم کے چہرے پر مسرت کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی لیکن جج نے بات کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا ....

"مقدمہ کی کاروائی کو مزید صاف کرنے کے لئے عدالت محترم وکیلِ صفائی

سے ایک ذاتی سوال کرنا چاہتی ہے؟"

امجد اس سوال سے ذرا بھی نہ گھبرایا۔

"جنابِ والا .... میں عدالت میں آنے سے پہلے ہر قسم کے حالات اور سوالات کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر کے آیا ہوں .... جیسا کہ عدالت جانتی ہے، میں اسی ماں کا بیٹا ہوں، جو موضوعِ مقدمہ ہے .... مگر میرا ذہن صاف ہے۔ میں عدالت کی کاروائی کو آگے بڑھانے اور عدالت کو انصاف کے قریب پہنچانے کے لئے پورا پورا تعاون کروں گا"۔

جج نے اس کے رویّے کی تعریف کی۔

"عدالت آپ کے جذبے کی قدر کرتی ہے۔ عدالت کا مقصد یہ ہے کہ وہ عورت، جس کی معصومیت اور مظلومیت کی آپ نے کامیاب دلیلیں دی ہیں، زندہ ہوتی تو آپ کا رویہ کیا ہوتا ....؟"

امجد نہایت تحمل اور صبر سے بولا۔

"جنابِ والا .... میں اس عورت کو آنکھوں میں بٹھاتا۔ میں فخر سے اسے ماں کہتا کیونکہ وہ ایسی ماں تھی، جسے زبردستی ماں بنا دیا گیا تھا۔ زبردستی ایک بچہ اس کی کوکھ میں ڈال دیا گیا تھا، اس احساس کے ساتھ کہ تُو ماں ہے مگر اپنے بیٹے کو بیٹا نہیں کہہ سکتی ....

"کاش ....! وہ زندہ ہوتی، تب میں اسے کہتا .... ماں، بتا وہ کون ہے جو تجھے ناجائز بچے کی ماں کہہ کر شرمندہ کرتا ہے .... وہ کون ہے ماں، جو تم سے جینے کا حق چھینتا ہے اور وہ کون ہے ماں، جس نے ناکردہ گناہی کا سارا بوجھ تمہارے کمزور کندھوں پر لاد دیا ہے ....؟

"جنابِ والا .... کیا خطا تھی میری ماں کی ....؟ کس گناہ کی پاداش میں وہ سولی پر لٹکی رہی ....؟ اس لئے کہ وہ بے بس تھی، اس لئے کہ وہ کمزور تھی۔ اس

لئے کہ ایک درندے کے مقابلے کی تاب نہیں تھی اس میں ....؟ واہ .....!

"کیا سوچ ہے ہمارے معاشرے کی' کیا رویہ ہے ہمارے سماج کا' ظلم بھی روا' اور ظلم سہنے والے سے نفرت بھی روا' بربریّت کو داد اور بربریت کے شکار ہونے والے کو بے داد ....

"جنابِ والا .... یہ تو وہی ہوا نا' جس کی لاٹھی اس کی بھینس' اگر اس مہذب صدی میں بھی یہ محاورہ درست ہے تو مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہماری تہذیب نے صرف کپڑوں کے خراش تراش کا نام تہذیب رکھ چھوڑا ہے۔ ورنہ ذہنی طور پر ہم وہیں ہیں' جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا .... اس لئے کہ قتل اب بھی ہوتے ہیں' حقوق اب بھی غصب ہوتے ہیں، عصمتیں اب بھی لوٹی جاتی ہیں۔

"جنابِ والا ! پھر کونسی ترقی اور کونسی تہذیب' کونسا سماج اور کونسا معاشرہ .... کونسا غلط اور کونسا سچ .... اور کونسی بنیاد ہے جنابِ والا' جس کو اصول سمجھ کر میں اپنی ماں سے نفرت کروں؟ کونسی اساس ہے جس کو مثال بنا کر اس کے کردار کے بارے میں شک و شبہ کا رویہ اختیار کروں ......؟ اور یا یہ کہ اپنے آپ کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دوں کہ میں ناجائز اولاد ہوں ....؟

"جنابِ والا .... میری ماں آسانی سے یہ کر سکتی تھی کہ پیدا ہوتے ہی میرا گلا گھونٹ دیتی۔ وہ ایک ناجائز بچے کی ماں ہونے کے الزام سے بچ سکتی تھی مگر یہ تو خود غرضی کی زندگی ہوئی جنابِ والا' کہ وہ ایک بے بس معصوم بچے کی زندگی کے بدلے چار دن کی خوشیاں سمیٹ لیتی .... مگر وہ تو ماں تھی جنابِ والا ....

"دنیا کی عظیم ماؤں کی طرح عظیم ماں تھی ....

"ظاہر ہے' اس نے روئے زمین کی تمام ماؤں کی ممتا کی لاج رکھنی تھی ....

خود سدھار گئی مگر ممتا کے لافانی جذبے کو زندہ رکھا کہ یہی ممتا کی شان تھی ....

"جنابِ والا ...... ایک بے کس ماں کے مرنے کے معنی یہ تھے کہ اس نے

اپنے بیٹے پر جینے کی ذمہ دار ڈال دی تھی اور آج' جبکہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ میں بربریّت کی گود میں جنم لینے والی ناجائز اولاد ہوں' خودکشی نہیں کروں گا۔ بلکہ معاشرے کی اٹھتی ہوئی انگلیوں اور طنزیہ نگاہوں کے باوجود جینے کی پوری پوری ذمہ داری قبول کرتا ہوں .... کیونکہ یہ ذمہ داری ایک مظلوم ماں کی امانت ہے ....!

"اور ساتھ ہی کٹہرے میں کھڑے مسٹر عدیم کا احسان بھی کبھی نہ بھولوں گا' جنہوں نے مجھے یہ ذمہ داری قبول کرنے کے اہل بنایا ہے ....

جنابِ والا .... میں جب ماضی کی طرف لوٹ کر دیکھتا ہوں تو مجھے ان دھندلکوں میں ایک معصوم لڑکی نظر آتی ہے اور اس کے ساتھ ایک شریف خوبصورت نوجوان ......

"مجھے اس لڑکی کے وہ تاریخی الفاظ یاد آتے ہیں' جب وہ ایک معصوم بچے کو اس نوجوان کے حوالے کر کے کہتی ہے ....

"عدیم ....! تم یہ بچہ دیکھ رہے ہو نا' یہ تمہارے باپ کا بھی بیٹا ہے اور تمہاری محبوبہ کا بھی۔ اس کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے' اس میں تمہارا بھی حصہ ہے' میرا بھی حصہ ہے ...... پر قدرت کی ستم ظریفی دیکھو، نہ اپنے باپ کے بیٹے کو بھائی کہہ سکتے ہو اور نہ اپنی محبوبہ کے بیٹے کو بیٹا کہہ سکتے ہو ....!"

"جنابِ والا ...... آخر وہ لڑکی مر گئی .... یہی وہ لمحہ تھا کہ مسٹر عدیم سابقہ عدالت سے بری ہونے کے باوجود اپنے ضمیر اور روح سے انصاف کی خاطر دوبارہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا .... لیکن لڑکی کی موت کے بعد معصوم بچے کے مستقبل کا بار ان کے کندھوں پر آن پڑا ....

"جنابِ والا .... اٹھائیس برس بیت گئے۔ جب تک یہ بچہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہوا' یہ شریف شخص مسلسل اٹھائیس برس تک روحانی اور نفسیاتی الجھنوں میں تڑپتا رہا .... ایک طرف اس بچے کے کچھ بن جانے کی لگن' دوسری طرف اپنی

روح سے انصاف کی تڑپ ...... سزا تو صرف ایک لمحے کی اذیت کا نام ہے حضورِ والا ...... پھانسی پانے ولا مجرم ایک جھٹکے کے بعد ساری مصیبتوں سے نجات پا لیتا ہے لیکن میرا مؤکل تو پوری چوتھائی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ سولی پر لٹکتا رہا ہے۔

"اس وقت مسٹر عدیم کی عمر پچاس برس سے کچھ اوپر ہی ہے ...... اور اس بچے کی عمر جو امجد کی شکل میں آپ کے سامنے کھڑا ہے، ستائیس اٹھائیس برس ہے ...... جنابِ والا' مسٹر عدیم نے اپنی عمرِ عزیز اس خواہش میں گنوا دی کہ ظلم کی گود میں جنم لینے والا بچہ اس معاشرے کا شریف شہری بن سکے ......

"عدالت اس عظیم انسان کے کردار کو کونسی کسوٹی پر پرکھتی ہے۔ یہ عدالت کی صوابدید پر منحصر ہے لیکن جہاں تک اخلاق' اقدار اور زندگی کی آدرشوں کا تعلق ہے' ایسا مثالی آدمی اس زمین پر نہیں ملے گا ......

"مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم اس پر مقدمہ چلا رہے ہیں چہ جائیکہ ہم اس کو آنکھوں میں بٹھاتے ۔ ہم نے اسے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے۔

"بس جنابِ والا ...... میں اپنا بیان ختم کرتا ہوں !!"

وکیلِ صفائی کی مؤثر تقریر سے ایک بار پھر عدالت میں سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

صرف عدیم ہی ایک واحد شخص تھا، جس کے چہرے پر سکون و اطمینان کی گمبھیر راحت تھی اور آنکھوں میں ملکوتی چمک ......

سرکاری وکیل نے بھی سر جھکا لیا تھا۔ جج کا لہجہ بھی ایک حد تک گمبھیر ہو گیا تھا۔ اس نے سرکاری وکیل کی طرف دیکھا ......

"وکیلِ صفائی کے دلائل سننے کے بعد وکیل استغاثہ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

سرکاری وکیل نے نظر اٹھا کر جج کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولا۔

"نو سر......!"

جج اب ملزم سے مخاطب ہوا۔

"ملزم عدیم کچھ کہنا چاہتا ہے؟"

عدیم مسکرایا۔ اس نے پیار سے ایک نظر امجد کی طرف دیکھا۔ پھر اطمینان کے لہجے میں جج سے مخاطب ہوا۔

"جنابِ والا ...... آج میری زندگی کی تکمیل ہو گئی ہے ...... مجھے اور کچھ نہیں کہنا ......"!

عدیم کا جواب سن کر فرطِ جذبات سے امجد آبدیدہ ہو گیا ......

جج نے ایک نظر سامعین پر ڈالی۔ پھر وکیلوں کی طرف دیکھا۔

"عدالت برخاست کی جاتی ہے' پرسوں فیصلہ سنایا جائے گا"۔

عدیم کٹہرے سے اترنے لگا تو امجد لپک کر اس کے قریب آ گیا۔ عدیم رک گیا۔ فرطِ مسرت سے اس کا سینہ پھول گیا۔ اس نے امجد کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

دونوں ایک دوسرے کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے' جس کی بلاغت کو دونوں کی روحوں نے پورا پورا محسوس کیا۔ دو انسانوں کو جب ایسے لمحے نصیب ہوتے ہیں تو مکالمے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

امجد بھول گیا تھا ...... کہ وہ ناجائز بچہ ہے کیونکہ اس لمحے اس کی روح نے جو بالیدگی محسوس کی' وہ لافانی تھی ...... یہ انسان ہی کا مقدر ہے۔ چاہے وہ کسی نسل اور کسی جَد سے کیوں نہ ہو ...... وہ کسی بھی خون سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ بالآخر وہ انسانی جذبوں کا وارث ہے۔

عدیم بھی آدھی صدی کا دکھ بھول گیا تھا اگر اسے پچاس برس اور جینا ہوتا۔ ایسے ہی لمحے کے انتظار میں تو وہ بخوشی یہ سودا قبول کر لیتا۔! عطائے زندگی تو بس ایک لمحے کی کہانی ہوتی ہے!!

امجد عدالت سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو شائستہ کی آنکھوں میں دیئے جھلملا رہے تھے۔ وہ شوہر کی آج کی بحث سن چکی تھی۔

چار سال شادی کو ہو گئے تھے ...... جج کی بیوی کی حیثیت سے اسے جو امتیاز حاصل تھا آج ایک وکیل کی بیوی ہونے سے اس افتخار میں کمی آ جانے کی بجائے اضافہ ہو گیا تھا۔

آج اس پر پہلی بار انکشاف ہوا تھا کہ اس کا شوہر کتنا ذہین اور غیر معمولی آدمی ہے۔

امجد نے بیوی کی یہ کیفیت دیکھی تو اسے ایسا لگا کہ آج سے وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہا ہے اور نئی زندگی کی صبح آج ہی عدالت میں طلوع ہوئی تھی۔

وہ کیسے نئے نئے جذبوں سے آشنا ہوا تھا ...... آج عدیم کی آنکھوں میں اس نے جو کچھ پایا تھا' اس سے پہلے کبھی نہ پایا تھا ...... آج شائستہ کی آنکھوں میں وہ جو کچھ پا رہا تھا' چار سال میں وہ اس کا سراغ نہ لگا سکا تھا۔

ایک جھٹکے نے اسے عرش سے فرش پر گرا دیا تھا مگر ایک ہی جست نے اسے فرشتوں سے ہمکلام کر دیا تھا۔

کل وہ عدالت عالیہ کا جج تھا' آج وہ اس عدالت کا محض ایک وکیل تھا لیکن وہ اپنے آپ کو کل کی نسبت آج زیادہ قوی اور توانا محسوس کر رہا تھا۔ حقدار کو

خاموشی سے حق دے دینے میں وہ مزہ نہیں تھا جو حق کو للکار کر حاصل کرنے میں تھا۔

اس نے شائستہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ......

"تم نے مجھے نیا جیون دیا ہے شائستہ! میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے مجھے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا ڈھنگ سکھایا ہے!"

شائستہ عقیدت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی ......

"آپ نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔ بس یہی میری جیت ہے"۔

"شائستہ ......!" وہ جذبے سے بولا ...... "میں جج رہتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ میری زندگی ایک سُست رفتار ندی کی طرح خاموشی سے گزر جاتی۔ قانون کے چند طے شدہ اصولوں کی خاطر زندگی گزارنا عجیب ہوتا یعنی ایسے اصولوں . . . . کی خاطر جن پر شبہ کیا جا سکتا ہو کہ کل یہ غلط بھی ہو سکتے ہیں ...... واہ' یہ کیسی تبدیلی ہے کہ آج میں آزاد ہوں اور قانون کو چیلنج کر سکتا ہوں اور انسان کی عزت نفس کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا سکتا ہوں ...... شائستہ' یہ کتنی بڑی طاقت ہے۔ انسان کتنی طاقت ور چیز ہے ...... اس کا احساس مجھے تم نے کرایا۔ تم بھی میری ماں کی طرح عورت ہونا' ایک عظیم ماں' جو انسان کو جنم دیتی ہے اور ہر صدی میں توانائی کا عمل جاری رکھتی ہے!!"

شائستہ جوش اور فخر سے بولی۔

"مجھے فخر ہے کہ یہ آپ ہیں ......!"

"ہاں ...... یہ میں ہوں' جسے تم نے ایک پھونک مار کر قبر سے نکالا ہے اور یہ تم ہو جو محبت کا جادو جگاتی ہو۔ خود ہی سحر میں جکڑ لیتی ہو اور خود ہی سحر کو توڑ دیتی ہو ...... ہاں' یہ میں ہوں شائستہ' جسے ایک معصوم عورت نے جنم دیا اور جسے ایک وفا شعار بیوی نے زندگی کی رمز سے آشنا کیا"۔

"میں' جو کچھ ہوں' آپ کی بدولت ہوں سرتاج۔ شوہر کے بغیر عورت کی کوئی

حیثیت نہیں بنتی ...... جوان عورت سے تو اس کے بھائی اور باپ بھی خوف زدہ رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے شائستہ' ٹھیک ہے۔ ایک دوسرے کے لئے زندہ رہنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ روئے زمین کے ہر انسان کے اس احساس کو زندہ اور محفوظ رکھنا چاہیے کہ دنیا میں چند ایسے لوگ ہیں جو اسے سچے دل سے پیار کرتے ہیں اور خود وہ بھی کچھ لوگوں کے لئے سچے جذبات رکھتا ہے۔ مثلاً تم ہو' عدیم صاحب ہیں' ہمارا بچہ ہے، ہمارا بابا ہے جنہیں دیکھ کر جینے کی امنگ دو چند ہو جاتی ہے اور روح میں گدگدی ہونے لگتی ہے۔"

شائستہ شوہر کے اس نئے روپ کو فخر اور غرور سے دیکھ رہی تھی۔ "ہاں ہاں ...... یہ بہت اہم بات ہے شائستہ۔" امجد اس کی محویت دیکھ کر بولا۔ "آدمی چاہے تو اپنی ذاتی محبتوں کو پھیلا سکتا ہے۔ ...... اسے مزید وسعت دے سکتا ہے ، اسے اپنے محلے اور شہر تک پھیلا سکتا ہے۔ ...... مگر اس کے بیج سب سے پہلے گھر کے آنگن میں اگانے ہوں گے ...... گھر میں پیار کی مہک ہو گی تو سارے محلے میں پھیل جائے گی' پھر اس کی حدود متعین نہ کی جاسکیں گی۔ یوں سارا شہر مہک جائے گا۔"

شائستہ جوش میں بولی۔

"آپ نے ایسی خوبصورت باتیں پہلے کبھی نہیں کیں۔ یہ عدیم صاحب ہی ہیں' جنہوں نے ہمارے ذہنوں کو جلا بخشی ہے ...... میں سچ کہتی ہوں' میں نے زندگی میں ایسی غیر معمولی شخصیت پہلی بار دیکھی ہے۔ یہ وہی ہیں جس نے ہم سب کو اپنے وجود کا احساس کرایا ہے۔ یہ ان کی استقامت ہے کہ آج ہمارے من روشن ہیں۔"

"ہاں شائستہ' وہ مثالی آدمی ہیں۔ ایسے لوگ صدیوں میں جنم لیتے ہیں۔ یہ زندگی کے حقیقی کردار معلوم نہیں ہوتے کیونکہ جو دنیا ہم دیکھتے ہیں' وہ اس سے مختلف ہوتے ہے لیکن اس کا مطلب یہ کب نکلتا ہے کہ ہم مثالیت کو رد کر دیں

...... دیئے بجھا دیں اور ہجوم میں گم ہو جائیں!"

"یاد ہے آپ کو۔" شائستہ بولی ...... "جب آپ کی تقریر ختم ہو گئی تھی اور جج نے ان سے پوچھا تھا کہ ملزم نے کچھ کہنا ہے ...... تو ان کی مسکراہٹ کس غضب کی تھی۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور انہوں نے کیسا تاریخی فقرہ کہا تھا ...... 'جناب والا' آج میری زندگی کی تکمیل ہو گئی ہے۔ مجھے کچھ نہیں کہنا'......!"

"تبھی تو کہتا ہوں کہ وہ عام آدمی نہیں ہیں۔ ان کے نقش قدم پر چلنا انسان کے بس کا روگ نہیں ہے ...... کاش' جس طرح ان کی زندگی کی تکمیل ہو گئی ہے' یہی انسان کا مقدر بن جائے؟"

دیر تک دونوں عدیم ہی کی باتیں کرتے رہے۔ چائے پر' ڈنر پر اور رات جب تک وہ جاگتے رہے اسی کی باتیں کرتے رہے ...... اگلے دن عدالت میں معمول سے زیادہ لوگ تھے۔ فیصلہ سننے کیلئے وکلاء کی بھی خاصی تعداد موجود تھی ...... شائستہ اور اس کا بچہ اور مالی بابا بھی فیصلہ سننے آئے تھے ......

جج فائل دیکھنے میں محو تھا...... عدیم سنجیدہ اور مطمئن کھڑا تھا۔ کبھی کبھی اس کی نظریں مالی بابااور شائستہ کی طرف اٹھ جاتیں تو ایک لطیف سی لہر اس کی آنکھوں میں لہرا کر غائب ہو جاتی۔

اچانک جج نے میز سے نظریں اٹھائیں ...... اس نے ایک نظر متانت سے چاروں طرف دیکھا۔ سب لوگ دم بخود احترام اور تجسس سے جج کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جج نے اپنی بھاری آواز سے مگر دھیمے لہجے میں بات کا آغاز کیا ......

"میری عدالتی زندگی میں یہ پہلا مقدمہ ہے' جس نے مجھے ایک حد تک امتحان میں ڈال دیا تھا ...... ایک طرف جذبات و احساسات اور انسانی نقطۂ نگاہ کے تقاضے تھے' تو دوسری طرف قانون اور انصاف کا کوہِ گراں تھا ...... ایک جج کی حیثیت سے مجھے اس کوہِ گراں کو بھی سر کرنا تھا اور ایک انسان کی حیثیت سے مجھ پر انسان کے

بنیادی جذبوں کا احترام بھی لازم تھا .... قانون کا صحیح استعمال اپنی جگہ قابلِ عزت ہے اور انسان کی نیک نیتی اپنی جگہ قابلِ تحسین ...... مانا کہ قانون کا دل نہیں ہوتا لیکن قانون کو عملی جامہ پہنانے والا کرسی پر جو جج بیٹھا ہوتا ہے اس کے سینے میں دل ہوتا ہے۔ جب مشکل وقت آتا ہے تو یہی دل ہوتا ہے جو سچائی کی منزل تک پہنچانے کی رہبری کرتا ہے ......'

"عدالت نے اس مقدمے کی کاروائی کو غور سے سنا۔ غور سے پڑھا اور مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے ....'

"اول یہ کہ ہنگامی جذبے یا اشتعال کے تحت جو جرم سرزد ہوتا ہے رعایت کا مستحق گردانا جاتا ہے .... اس بارے میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلے بھی ہماری رہنمائی کرتے ہیں .... چنانچہ ان فیصلوں کی روشنی میں سیٹھ داؤد کا قتل زیر دفعہ تین سو دو تعزیراتِ پاکستان' قتلِ عمد کی تعریف میں نہیں آتا ....'

"دوم یہ کہ وکیلِ صفائی نے صحت مند معاشرے کا جو تصور پیش کیا ہے عدالت نہ صرف اس سے متاثر ہوئی ہے بلکہ اس سے مکمل اتفاق کرتی ہے......

"سوم' عدالت وکیلِ صفائی کے اس مؤقف سے اتفاق کرتی ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ ملزم نے جو رویہ اختیار کیا ہے' اس میں اس کی نیک نیتی شامل تھی اور حقیقت میں ایسے مثالی کردار کے لوگوں کو معاشرے میں عزت و احترام کے ساتھ جینے کا پورا پورا حق ملنا چاہئے .... لٰہذا میں مسٹر عدیم کو باعزت طور پر بری کرتا ہوں ...."

یہ فیصلہ سن کر لوگوں کے چہرے کھل اٹھے۔ غیر متعلقہ وکلاء تک خوش تھے اور امجد کو مبارک باد دے رہے تھے لیکن امجد ان سب سے جان چھڑا کر عدیم کی طرف لپکا .... اور بے ساختہ اس سے لپٹ گیا .... اپنی تمام تر سنجیدگی کے باوجود وہ زار و قطار رو پڑا .... اسے عدیم کے چوڑے چکلے سینے میں بے حد سکون محسوس

ہوا۔

خود عدیم کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر رہے تھے .... مالی بابا' شائستہ اور بچہ تینوں ان کے قریب آ گئے تھے۔ شائستہ ہونٹ کاٹ رہی تھی اور خوشی کے موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر گر رہے تھے۔

مالی بابا بہت ضبط سے کام لے رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں خوشی کے جذبات کا تلاطم برپا تھا۔

بچہ حیرت سے ماں اور باپ کو دیکھ رہا تھا .... اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ اجنبی کون ہے' جس کی خاطر اپنے اور پرائے سب کی آنکھوں میں آنسو ہیں......؟

شائستہ آنسو پونچھ رہی تھی کہ اچانک عدیم نے ایک بغل میں مالی بابا کو اور دوسری بغل میں شائستہ کو لے کر سینے سے لگا لیا۔

اب امجد کی بجائے شائستہ کی باری تھی ...... وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے سر عدیم کے سینے پر رکھ دیا تھا۔

امجد کی کیفیت عجیب تھی ...... وہ رو بھی رہا تھا' ہنس بھی رہا تھا۔ اس نے بچے کو اٹھالیا تھا .... اس پورے ماحول میں واحد یہ بچہ تھا' جس کو موجودہ صورتِ حال کی سمجھ ابھی تک نہیں آئی تھی۔

اور نہ وہ یہ راز جانتا تھا کہ اگر یہ غیر معمولی شخص نہ ہوتا تو آج اس کا بھی اس دنیا میں کوئی وجود نہ ہوتا ......؟

شاید اس بچے کی طرح اور بھی بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ وہ عدم سے کیسے وجود میں آتے ہیں ....

اور یہ سفر جو جاری ہے' کہاں سے شروع ہوا اور کہاں جا کر ختم ہو گا؟

اور یہ کہ زندگی کون دیتا ہے اور کون سلب کرتا ہے؟

اور دنیا کا وہ آخری آدمی بھی شاید کبھی نہ جان سکے گا کہ اس کے وجود کی خاطر کتنی

نسلوں نے کیا کیا دکھ جھیلے ہیں؟

بالکل امجد کے بچے کی طرح.........

جو آج کی صورتِ حال پر نہیں رویا تھا!

ΔΔΔ

سائیں دُلّا

اس کا نام کچھ اور تھا لیکن لوگ اسے سائیں دُلّا کہتے تھے۔

اس کا گاؤں دیہاتی میلوں ٹھیلوں کے لئے مشہور تھا۔ پتھر اٹھانا' نیزہ بازی' بیل دوڑ اور لمبی کوڈی (کبڈی) کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ ان سب کھیلوں میں لمبی کوڈی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

باہر کے بڑے بڑے نامور کھلاڑی آئے ہوئے تھے۔ دُور دراز کے دوسرے ضلعوں سے آئے لوگوں کی خاطر تواضع گاؤں کی لاج کا سوال تھا۔ کوئی روٹی' کوئی چائے' کوئی بستر' کوئی مکان' جس کے بس میں جو بات تھی وہ پوری کر رہا تھا۔ سائیں دُلّے نے بھی بھینس کے نیچے بیٹھ کر بالٹی بھری۔

باپ کی نظر پڑی تو وہ چلّا اٹھا۔

"کہاں لے جا رہے ہو دودھ؟"

سائیں دُلا بڑے دعوے سے بولا۔

"کھڈیاروں کے لئے..............!" (کھلاڑیوں کے لئے)

باپ نے اس کے ہاتھ سے بالٹی چھین لی۔

"کھدیاروں کا پتر۔ بڑا آیا سخی داتا!"

سائیں دُلّے نے باپ کو گھورا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس کے ہونٹ کپکپائے اور اس کا دل بھر آیا۔

"اگر .... اگر میں سائیں دُلّا ہوں دُلّا............. تو تو تو صبح تک تیری بھینس مرجائے گی، مرجائے گی!"

باپ نے بیٹے کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور بالٹی اندر لے گیا۔

سائیں دلا شام کو گاؤں کی بیٹھک میں بھی نہ جا سکا۔ کس منہ سے جاتا، باپ نے تو مہمانوں کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔ وہ ساری رات اللہ میاں سے دعا مانگنے کے بجائے جھگڑتا رہا۔

"اگر صبح تک فقیرے کی بھینس نہ مری تو میں خود مرجاؤنگا، میں خود مرجاؤنگا!"

صبح ہوئی۔

بھینس مری پڑی تھی۔ ایک چت کبرا سانپ کھرلی میں کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔

پانچ سو روپوں کی بھینس............ باپ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ماں نے بیٹے کو نئی نگاہوں سے دیکھا۔ گاؤں گاؤں بات پھیل گئی۔ عبداللہ کا نام سائیں دُلّا پڑ گیا۔ ان کا گاؤں کبڈی ہار گیا۔ گاؤں کی لاج مٹی میں مل گئی۔ دوسرے گاؤں والے ڈھول شرنائیاں اور فتح کے نعرے لگاتے ہوئے چلے گئے۔ ایک ہفتہ تک گاؤں کی ہار پر چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ پھر سب بھول بھال گئے۔

لیکن سائیں دلا گاؤں کی ہار نہ بھولا تھا۔ پڑوس کے ضلع میں ایک بہت بڑا کھلاڑی تھا، جسے اگر لایا جاتا تو گاؤں کی لاج جیتی جا سکتی تھی مگر وہ تو پیشہ ور کھلاڑی تھا۔ کھیل کھیلنے سے پہلے دو سو روپے پیشگی لیتا تھا اور دو سو روپے سائیں دُلّے کے پاس نہیں تھے۔

لیکن گاؤں کی مستقل ہار بھی تو بہت بُری بات تھی۔ وہ کئی دن تک اس کے متعلق سوچتا رہا۔ آخر ایک دن اس نے گاؤں والوں سے کہہ دیا۔

"تم لوگ کبڈی کی تاریخ طے کر لو، پیرو ضرور آئے گا!"

پیرو کی آمد سے کبڈی یقیناً جیتی جا سکتی تھی لیکن وہ تو دو سو سے کم کوئی سودا قبول نہیں کرتا اور دو سو سائیں دُلّے کی جیب میں کہاں، گاؤں والے مذاق کرتے رہے۔

..........اور سائیں دلا کئی دن کی مسافت کے بعد پیرو کے گاؤں پہنچ گیا۔ پوچھتے پوچھتے اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پیرو کی ماں دو سال ہوئے مرگئی ہے۔ اس نے گاؤں کی مسجد میں قرآن مجید لیا اور سیدھا قبرستان پہنچ کر پیرو کی والدہ کی قبر پر پڑھنا شروع کر دیا۔ بات سارے گاؤں میں پھیلتے پھیلتے پیرو تک پہنچ گئی۔ دوسرے ضلع میں سائیں دلے کو کون جانتا تھا۔ پیرو نے آ کر پوچھا۔

"بھئی کون ہو تم؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم چاہتے کیا ہو؟"

سائیں دُلّے کا صرف ایک ہی جواب تھا۔

"پہلے قرآن مجید کا ختم کرنے دو، بعد میں بات ہو گی۔"

پیرو اسے پردیسی سمجھ کر پانی اور روٹی لایا مگر سائیں دلے نے صاف انکار کر دیا۔

"میں سودا کرنے نہیں آیا۔ تمہارے گھر کی کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔"

قرآن مجید کا ختم ہو گیا۔ تو پیرو پھر گڑگڑایا۔

"میرے لئے حکم؟"

سائیں دلا بولا۔

"تم کبڈی کھیلتے ہو۔ پیسہ لیتے ہو اور اپنا پیٹ بھر لیتے ہو لیکن تمہاری ماں کو تمہارے روپوں سے کچھ نہیں ملتا۔ میں تمہارا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ اس لئے کہ میرے

پاس روپیہ نہیں ہے لیکن تمہاری ماں کو ثواب پہنچا دیا ہے۔ ہمارا گاؤں کبڈی ہار گیا ہے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا!"

پیرو نے سر تسلیم خم کیا۔

"چلوں گا!"

سائیں دلا بولا۔

"میں پیدل آیا ہوں۔ کرایہ میرے پاس نہیں ہے۔ البتہ واپسی کا وعدہ کرتا ہوں"۔

پیرو مسکرایا۔

"میں اپنے خرچ پر چلوں گا!"

گاؤں والے حیران اور خوش تھے۔ سائیں دُلّے نے گاؤں کی لاج رکھ لی تھی۔ پیرو کبڈی جیت گیا تھا۔ سارا گاؤں ایک جگہ جمع ہو گیا۔ چندہ اکٹھا کیا گیا۔ پانچ سو روپے جمع ہو گئے۔ بڑے عزت و احترام سے پیرو کی خدمت میں تھیلی پیش کی گئی مگر پیرو نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔

"میں سودا کرنے نہیں آیا تھا۔ میں ایک فرض کا دامن پکڑ کر آیا تھا۔ یہ سائیں دلے کا حق ہے۔ اسے میری طرف سے سائیں دلے کی خدمت میں پیش کر دو!"

سائیں دلے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پیرو ہمیشہ سے جیتتا آیا تھا۔ اس نے بڑے بڑے بڑے میدان سر کئے تھے۔ بڑے بڑے انعام حاصل کئے تھے لیکن آج کی جیت بالکل نئی جیت تھی۔ آج کا انعام بالکل انوکھا انعام تھا۔ آج کی خوشی میں ایک نیا رنگ' ایک عجیب کیف تھا۔ آج اس کی جیب خالی تھی لیکن من خالی نہیں تھا۔ آج اس کے سینے میں خوشی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

تھیلی تین دن تک سائیں دلے کی بھاری شلوار کے ساتھ بندھی لٹکتی رہی۔

گاؤں والوں کو نئی بات ہاتھ آ گئی

"سائیں دلے شادی کر لو۔ بڑی رقم ہے' گھر آباد ہو جائے گا!"

لیکن سائیں دلا مسکرا دیتا۔ شادی کی بات ہوتی تو اب تک ہو چکی ہوتی۔ اس کا باپ کھاتا پیتا آدمی تھا لیکن سائیں دلا اپنے ذہن کی بات جانتا تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ والدین نے شادی کے لئے اصرار کیا لیکن وہ ٹالتا رہا۔

"جوگی کس کے میت..............!"

وہ خوامخواہ کیوں کسی کے گلے میں پھندا ڈال دیتا۔ وہ سیلانی آدمی تھا۔ آج یہاں' کل وہاں۔ باپ کے گھر کو کبھی اپنا گھر نہ سمجھتا تھا۔ جی میں آیا تو چھ چھ مہینے گاؤں سے غائب رہتا۔ نگر نگر کی سیر۔ رات آتی تو گاؤں کی مسجد میں ڈیرا لگا دیتا۔ روٹی تو مل ہی جاتی۔

.........گاؤں میں بھی ہر گھر اس کا اپنا گھر تھا۔ سائیں دُلّے سے کسی کو دشمنی نہیں تھی۔ جی میں آیا تو سارا دن کسی کے کام میں لگا رہا۔ جی میں آیا تو سارا دن کسی مزار کی چار دیواری کو لیپتا رہا.............. ہر آدمی سے اُس کا مذاق تھا۔ بچے' مرد' عورتیں سب ہی سے ایک ہی قسم کا سلوک تھا۔ عورتیں اس پر بڑا اعتقاد رکھتی تھیں۔

سائیں دلا سچ مچ کا فقیر ہے!

لیکن سائیں دلا خود کو سمجھتا تھا' نہ وہ فقیر تھا نہ ولی' بس ایک انسان تھا۔ عام آدمیوں سے ذرا مختلف اور اس انوکھے پن کی وجہ بالکل قدرتی تھی۔ اس نے طبیعت ہی ایسی پائی تھی کہ بس ایک ہنگامہ سا ہو۔ جس میں زندگی کی چہل پہل اور ندی کی طرح روانی ہو۔ پرندوں کی طرح آزادی ہو کہ جہاں چاہیں اڑیں۔ گھونسلے بنائیں اور چھوڑ دیں۔ ایک ماحول میں زندگی گزار دینا یہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔

وحشت میں بھی تو ایک زندگی ہوتی ہے۔ انتشار اور بدنظمی میں بھی تعمیر کی ایک گونج ہوتی ہے۔ بس یہی اس کی زندگی تھی ۔"

پانچ سو روپے اس کی شلوار سے لٹک رہے تھے۔ کچھ نوٹ تھے جو کھڑکھڑا رہے تھے۔ کچھ سکے تھے جو کھنکھنا رہے تھے۔ پانچ سو روپوں سے تو بڑا ہنگامہ برپا ہو سکتا ہے!

اگلے دن اس نے گاؤں کے قریب چند مزدور لگا دیئے۔ ڈھول اور شرنائیاں بجنے لگیں۔ مزدور کام کرتے رہے۔ سائیں دُلّا ناچتا رہا............ گاؤں والے ہنستے رہے۔ پانچ سو روپے کسی طرح برباد تو کرنے ہیں' سو اس طرح سہی دُلّے کو چند دن تک ڈھول اور شرنائی اور ہنگاموں کا ساتھ تو رہے گا۔

سب جانتے تھے۔ ان کے علاقے میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ صدیاں گزر گئیں ۔ کیا اب تک کئی کنویں کھودے نہ جاتے............ لیکن سائیں دُلّے کو ان باتوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہ اپنے مقصد سے چمٹا ہوا تھا۔

ہنگامہ............

وہ ہو رہا تھا۔ ہنسنے والے بھی آ کر تماشہ دیکھتے،حقہ پیتے' دھواں اور ہیر کی تانیں اڑتیں۔ مزدور زمین کے سینے میں سانس لے رہے تھے۔ سائیں دلا جھانکتا۔

"شاباش! آج ڈیڑھ گز اور نیچے جائے گا۔"

کنوئیں کے ارد گرد سخت اور خشک مٹی کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ کنواں تیس گز جا چکا تھا۔ اوپر کی تہہ نیچے کی تہہ' دونوں کی مٹی ایک جیسی تھی۔ گاؤں والوں کے قہقہے بکھرتے رہے۔

"چلو اچھا ہوا۔ مزدوروں کو مزدوری تو مل رہی ہے!"

لیکن سائیں دلّے کی ہنسی اتنی بے جان نہ تھی۔ وہ اپنے مقصد کو زندگی دے رہا تھا۔ پانی نکلے نہ نکلے' ماحول تو زندہ ہے۔

چالیس گز پر مٹی کا رنگ بدل گیا۔ اس میں کچھ نمی سی تھی............ مگر

گاؤں والے پھر بھی ہنستے رہے۔

"اندر گھمس زیادہ ہے۔ مزدوروں کے پسینے سے مٹی گیلی ہو گئی ہے!"

لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ گہرائی پچاس گز تک پہنچی تو کیچڑ نکلنے لگا۔ سائیں دلا مسکرایا۔

"شاید مزدوروں کا پسینہ زیادہ بہنے لگا؟"

لیکن پانچ سو روپے ختم ہو گئے! کنوئیں کے آس پاس گیلی مٹی کے انبار لگ گئے تھے۔ پینے کے لئے پانی تین میل دور ایک ندی سے لایا جاتا تھا۔ چنانچہ سائیں دُلّے کا ہنگامہ گاؤں والوں کا نصب العین بن گیا۔ ایک بار پھر سارا گاؤں جمع ہو گیا' فیصلہ ہوا کھدائی جاری رہے گی۔

چنانچہ سات گز کی کھدائی کے بعد پانی اچھلنے لگا۔ چاروں طرف سے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ ٹھنڈا شفاف اور میٹھا پانی۔

خون گرایا گیا۔ قربانیاں کی گئیں۔ بکرے اور دبنے ذبح کئے گئے۔ ایک ہفتے تک کنوئیں پر جشن رہا۔ ہر آدمی نے اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ دیا۔ سائیں دلا گاؤں کا ہیرو بن گیا۔ عورتیں اسے سائیں جی کہنے لگیں۔

لیکن اسے نام و نمود اور ستائش،کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ وہ خوش تھا تو اس لئے کہ لوگوں نے دیکھا دیکھی کنوئیں کھودنا شروع کر دیئے۔ جگہ جگہ کھیتوں میں مزدوروں کی ٹولیاں کام کر رہی تھیں۔ ڈھول بج رہے تھے ، دھوئیں اڑ رہے تھے۔ ہیر کی تانیں لرز رہی تھیں۔ سائیں دلے کا دن بڑا مصروف گزرتا۔ صبح کی چائے ایک ٹولی کے پاس' دوپہر کی روٹی کسی دوسری جگہ' اور شام کی روٹی کسی تیسری محفل میں............ ہنگامہ تھا۔ چاروں طرف ہنگامہ' زندگی متحرک تھی اور سائیں دلا خوش تھا۔

حقے کی گڑگڑاہٹ ، ڈھول کی ڈھمک اور شرنائی کی گونج سب میں ایک بہتی ہوئی

لرزش تھی۔ جس کی مدھر لہریں پھیلتے پھیلتے چاروں افق متاثر کر رہی ہیں۔ سائیں
دلے کا تصور ان لہروں پر سوار تھا۔ وہ اپنے ہنگاموں کا پیغام چاروں سمت پھیلا رہا تھا۔
یہ سب کچھ تھا لیکن اس کے باوجود گاؤں کی ایک روح ایسی بھی تھی، جو سائیں دلے
کی ان ہنگاموں کو اپنی رسوائی کی چیخ وپکار سمجھتی رہی۔ زندگی کے یہ بجتے ہوئے نغمے
سانپ بن کر اس سے لپٹ جاتے۔ اندھیری شب میں جسے وہ سیاہ گلاب سمجھ کر ہاتھ لگا
بیٹھی تھی، وہ دراصل کالے ناگ کا پھیلا ہوا چمکیلا پھن تھا جو اسے ڈس بیٹھا تھا۔

وہ سوچتی، یہ چیخ و پکار .... ان ہنگاموں کے زہریلے نغمے،جب تک مَیں
بہری نہ ہو جاؤں گی، سنوں گی ....؟ میں اندھی تو ہو گئی تھی، بہری کیوں نہ
ہو سکی۔

سوچتے سوچتے اسے روشنی کی ایک کرن نظر آئی.......... سائیں دلے نے
ہمیشہ گاؤں کی لاج رکھی۔ اس نے ہمیشہ گاؤں کی ہار کو جیت کا روپ دیا ہے۔

میرے من کی تاریکی میں بھی شاید وہی روشنی پھیلا سکے۔ شاید وہی مجھے رسوائی
کی عفریت سے بچا سکے۔ وہی اس چیخ و پکار کو زندگی کے نغموں میں بدل سکتا ہے۔

وہ ہنگاموں کا خالق ہے۔ وہ ایک نئے ہنگامے سے نہیں ڈرے گا۔

وہ رات کی تاریکی میں سائیں دلے کے پیروں میں گر پڑی۔

"سائیں جی! سائیں جی مجھے بچاؤ!!"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ سائیں دلے نے زندگی کا یہ روپ کبھی نہ
دیکھا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی اس کے قدموں میں لوٹ رہی تھی۔ وہ پریشان ہو گیا۔

"کیا ہے بیگی؟"

بیگی گڑگڑانے لگی۔

"سائیں جی، اب دو ہی سہارے ہیں، ایک تم اور ایک تمہارا کنواں۔ تم نے
ہاتھ چھوڑ دیا تو تمہارے کنوئیں کا سینہ کھلا ہے"۔

سائیں دُلّا حیران رہ گیا۔

"تم ہوش میں ہو بیگی؟"

"ہاں.......... آج ہوش میں ہوں سائیں جی، جبھی یہاں آئی ہوں۔ ہوش
میں نہ تھی تو اپنی ہی ماں جائی کے گھر ڈاکہ ڈالا تھا۔ میرے پیٹ میں بچہ ہے سائیں
جی۔ میں نے اپنے بہنوئی سے منہ کالا کیا تھا۔"

سائیں دُلّے کا کلیجہ لرز اٹھا۔ بیگی سسکیاں بھرنے لگی۔

سائیں جی گھر والے مجبور کرتے ہیں کہ میں مرد کا نام بتاؤں۔ انہوں نے مجھے
مار مار کر ادھ مؤا کر دیا ہے لیکن سائیں جی خود تو تباہ ہو گئی ہوں، اب اپنی بہن کا بسا بسایا
گھر کس طرح اجاڑ دوں۔ سائیں جی اب موت کے سوا کوئی سہارا نہیں رہا"۔

سائیں دلے نے بڑے صبر سے یہ سب کچھ سنا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ
بھری۔ اس نے بیگی کا بھیگا ہوا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اٹھایا۔

"بیگی!"

بے حد پیار سے بولا۔

"جاؤ کہہ دو، سائیں دلے سے ہے!"

بیگی زار و قطار رونے لگی اور اس نے اپنے گیلے رخسار سائیں دلے کے
پیروں پر رکھ دیئے۔ پلک جھپکتے میں سائیں دلا سائیں دُلّو بن کر رہ گیا!

عورتیں اس سے نفرت کرنے لگیں۔ مرد اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ عقیدت
کے سارے موتی طنز کی آنچ سے پگھل گئے تھے۔ گاؤں کی پنچایت کے فیصلے کے مطابق
سائیں دلے کو بیگی سے عقد کرنا پڑا۔ سائیں دلا اب ایک بچے کا کنوارہ باپ تھا۔

گاؤں کے ہنگامے سرد ہو چکے تھے۔ گاؤں کی بیٹھک میں اب وہ زندگی نہ رہی
تھی۔ ڈھول شرنائی کی تانیں اور کبڈی کی گہماگہمیاں ختم ہو چکی تھیں لیکن سائیں
دلے کے سینے میں اب بھی ایک ہنگامہ برپا تھا۔ وہ سارا سارا دن کھیت میں کام کرتا۔

وہ خوش تھا۔ بیگی بھی خوش تھی۔ ان کا بچہ دن بدن کھیت کے منڈیروں پر کھیلا کرتا۔ بیگی کے تبسم میں ایسی زندگی تھی کہ سائیں دلا بھی حیران تھا کہ وہ اتنا عرصہ کیونکر بیگی کے بغیر زندہ رہا۔

☘☘

اندھی رُوح

اس کی رقت بھری آواز سن کر شاید ہی کوئی راہ گیر اسے نظر انداز کرتا۔ وہ آنکھیں بند کئے کلام الٰہی کو اس احترام اور درد بھری آواز میں پڑھتا کہ ایک بار تو گزرنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ کسی عام آدمی کا متاثر ہونا تو خیر کوئی بات نہ تھی لیکن اچھے خاصے روشن خیال آدمی جو کسی کو بھیک دینا قوم کو مفلوج بنا دینے کے مترادف سمجھتے' اس کو نظرانداز نہ کر سکتے۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ اس کی آواز سے دل میں ایمان اور یقین کی ایک رمق سی جاگ اٹھتی تھی۔

پھر وہ پیشہ ور بھیک منگا بھی تو نہ تھا۔ اس نے کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ اس کی آنکھوں میں کبھی التجائیں نہیں ناچیں۔ اس کی آنکھیں تو ہمیشہ کے لئے بند رہتیں۔ وہ اپنی بینائی کسی حادثے میں کھو چکا تھا اور اس لحاظ سے وہ ہمدردی کا مستحق بھی تھا۔

اور پھر اس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ بھیک مانگنے کے لئے اس نے کبھی اصرار

نہیں کیا۔ پُروقار انداز میں کلامِ الٰہی پڑھتا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے اللہ سے لو لگائے رہتا............ گزرنے والے اکنّی' دونّی' چونی اور کوئی اللہ کا بندہ روپیہ تک پھینک جاتا.... زمین پر پھیلی ہوئی ریزگاری کا ایک جال بچھ جاتا۔ حافظ جی تانبے اور چاندی کی کھنک سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن رہتا۔ اگر کوئی مخل ہوتا۔

"حافظ جی یہ ایک روپے کا نوٹ ہوا سے اڑ جائے گا"۔

تو وہ بڑے اخلاص سے مسکرا دیتے۔

"بھلا ہو' بھلا کرنے والوں کا۔ اللہ کا مال ہے کہاں جائے گا۔ اسے میرے ہاتھ میں تھما دو .... جزاک اللہ!"

اور پھر وہ نوٹ جسم کو ٹٹولتے ٹٹولتے کسی اندر کے کھیسے میں رکھ دیتے............ کلام کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جڑ جاتا۔ وہ دوبارہ اس انہماک سے آغاز کرتے' جیسے کوئی طلسمی موسیقی ڈوبتے ڈوبتے اُبھر آئی ہو۔

حافظ جی کے چہرے پر متانت اور اطمینان کی ایک ایسی لہر رقصاں رہتی' جسے نامرادی اور محرومی نے کبھی نہ چُھوا ہو۔ نادیدگی کی یاسیت نے اس کی طمانیت کو قطعی مفلوج نہیں کیا تھا۔ اس کی آواز کی طرح اس کا چہرہ بھی باوقار اور اس کا ذہن بھی صحت مند معلوم ہوتا تھا۔

بعض لوگ تو اس کے چہرے کی سادگی اور قناعت سے متاثر ہو کر اس کا دم بھرتے تھے۔ یہ اس صانعِ قدرت ہی کی کچھ مہربانی تھی کہ اس کی معصومیت پر یقین کرنے کو جی چاہتا تھا۔ ان سب خصوصیتوں نے یک جا ہو کر اسے ایک معصوم سا امتیاز بخش دیا تھا۔

وہ عام بھکاریوں کی طرح مارا مارا نہ پھرتا............ بس ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام کو بیٹھتا۔ جو کچھ اس کی قسمت میں ہوتا' مل جاتا۔ دونوں وقت ایک دس گیارہ برس کا لڑکا آتا اور ان کے ہاتھ پکڑ کر گھر پہنچا آتا............ یہ تو کسی کو پتہ نہ تھا کہ حافظ جی کہاں کے رہنے والے ہیں لیکن اس شہر میں وہ چند سالوں سے مقیم تھے۔ یہاں کی آب و ہوا سے وہ بہت مطمئن تھے اور شہروالوں کی خدا ترسی کے تو وہ بے حد مداح تھے۔ وہ فخر سے کہتے۔

"یہاں کے لوگوں نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ دو گھنٹے بیٹھتا ہوں اور میرے دو وقت کی روٹی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار رقم بچ بھی جاتی ہے' لیکن میں بچا کر کیا کروں گا۔ ایک جان ہے' اس کے لئے تازہ روزی مل جاتی ہے۔ بچی ہوئی رقم بھی ضائع نہیں جاتی۔ اڑوس پڑوس میں ناداروں کی کمی نہیں۔ آڑے وقت میں ان کے بھی کام آ جاتی ہے!"

یہی نہیں' حافظ جی کے متعلق کئی روایتیں مشہور تھیں............ مثلاً ہفتے کی بچی کھچی رقم سے وہ یتیم خانے کے لئے درس کی کتابیں اور کپڑے خریدتے۔ ہسپتال کے لاوارث مریضوں کے لئے تحفے بھیجتے............ ان کے چہرے کی وجاہت کے ساتھ ساتھ ان کے مشاغل بھی بڑے اللہ والے تھے۔ ہر وقت باوضو رہتے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے' جمعہ جمعرات روزہ رکھتے۔

شہر میں تو ان کی عزت تھی ہی............ لیکن محلے والے تو انہیں پوجتے تھے۔ کئی بیواؤں کا وہ سہارا تھے............ دینے والے جس سنجیدگی سے دیتے' حافظ جی اسی جذبے سے تقسیم کرتے............ شروع شروع میں مانگنے والے حافظ جی کو معذور سمجھ کر ایسی بات سوچنا بھی گناہ خیال کرتے۔ لیکن حافظ جی نے تو حق داروں کو خود عادی بنا دیا تھا۔

اگر کوئی کہتا بھی............

"حافظ جی بڑے شرم کی بات ہے' آنکھوں والے آپ سے مانگیں!"

تو وہ بڑے پیارے انداز میں غصہ فرماتے۔

"ارے بھائی کیا کہتے ہو۔ میں کون ہوں دینے والا' اپنا حق سب لے جاتے

ہیں۔ اللہ کا مال اللہ والوں کے ہاں نہ جائے گا تو پھر کہاں جائے گا۔ میرے پاس ہوتا تو دیتا ہوں، نہ ہوتا تو پھر میں دینے والا کون ہوتا............ کئی بار انکار بھی تو کیا ہے لیکن............ جب دینے والوں کے من میں روشنی موجود ہے تو پھر یہ قندیل کیوں نہ جلے۔ میں اللہ کی امانت کا بار کب تک اٹھائے رکھوں گا۔ جو دیا سو ہاتھوں ہاتھ واپس کر دیا............ وہ دینے پر راضی، ہم لٹانے پر خوش!............ اور پھر میرا کون ہے جس کے لئے فکرِ فردا کروں اور اگر کوئی ہو بھی تو مجھے کیا فکر............ فکر کرنے والا چاند تاروں کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا ہے۔ یہاں بھیجا ہے تو دو وقت کی روٹی ضرور دے گا اور............ جس روز یہاں کا دانہ پانی ختم ہو جائے گا تو اپنے پاس بلا لے گا۔ یہاں رہ کر بھی اس سے گلہ نہیں کیا، وہاں کی مہربانیوں کی تو انتہا نہیں ہو گی............ دیکھو تو مجھے ہی دیکھ لو۔ آنکھیں لے لیں، آواز دے دی۔ آنکھیں ہونے پر شاید اتنی خوشی نہ ہوتی، جتنی ان سے محرومی پر سکون بخش دیا ہے۔ وہ کسی حال میں بھی اپنے کرم سے غافل نہیں رہتا............ بندے سمجھیں یا نہ سمجھیں، اعتراف کریں یا نہ کریں، وہ تو اپنی خدائی شان کی عظمت برقرار رکھتا ہے............ وہ چاہے تو کسی کی ریاضت سے بے نیاز رہے اور کسی کے باغی ہو جانے پر مسکرا دے!!"

سننے والے سنتے اور حافظ جی کی عقیدت کا طوق اور بھاری ہو جاتا............

"کتنا بے نفس انسان ہے۔ کتنی بڑی شخصیت ہے۔ انسانیت کی کتنی سچی روح ہے۔ بغیر مانگے لیتا ہے، بغیر مانگے دیتا ہے۔ نہ لالچ نہ ہوس، نہ بے صبری............ یہاں سکون ہی سکون ہے، مسرت ہی مسرت ہے، سعادت ہی سعادت ہے۔"

وہ لڑکا جو حافظ جی کو سہارا دے کر ادھر اُدھر لے جاتا، اب بیس برس کا ہو چکا تھا۔ حافظ جی اسے بیٹا کہا کرتے۔ وہی اب بھی حافظ جی کو سہارا دیتا............ حافظ جی اس پر بہت مہربان تھے۔

لیکن ایک روز اچانک کھلبلی مچ گئی۔

"خون............! دن دھاڑے خون............!! برسرِعام قتل!!!"

ایک بیس سالہ نوجوان ہاتھ میں ننگا خون آلود چاقو لئے مجمع کو للکار رہا تھا............

"میرے نزدیک کوئی نہ آئے۔ میں بھاگوں کا نہیں۔ میں نے قتل کیا ہے۔ میں اقرارِ جرم کرتا ہوں۔ مجھے عدالت میں لے چلو۔ میں نے قانون کی خلاف ورزی نہیں کی، قانون کا احترام کیا ہے۔ میرے پاس اس کا ثبوت ہے۔ میں خود اس کا ثبوت ہوں۔"

"مجمع پر سکوت طاری تھا۔ اُدھر حافظ جی کی لاش تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ خون آلود چاقو کے ڈر سے کسی کو بھی حافظ جی کی ہمدردی کا خیال پیدا نہ ہوا۔ نوجوان نے بڑی بے دردی سے اس کی چھاتی اور چہرے پر وار کئے تھے۔ چہرہ اور داڑھی خون سے لت پت تھے اور مدافعت کی وجہ سے ان کی کئی انگلیاں کٹ گئی تھیں۔

پولیس آئی۔ حافظ جی کی لاش اور نوجوان دونوں کو لے گئی۔ جو بھی سنتا، حیران ہوتا۔ حافظ جی کی عقیدت کا رنگ اسی طرح چمکیلا تھا اور پھر حیرت کی بات یہ تھی کہ قاتل وہی نوجوان تھا، جسے حافظ جی نے پالا پوسا تھا اور جسے وہ بیٹا کہا کرتے!

اخباروں کی سنسنی خیز سرخیوں نے عوام میں ایک ہراس پھیلا دیا............

جس روز مقدمے کی ساعت ہوتی، اخباری نمائندوں اور عوام کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ قصہ دلچسپ ہرگز نہ تھا۔ انسانیت کی پستی کا ایک عبرت ناک اور المناک باب تھا۔

پولیس نوجوان کی نشان دہی پر مختلف عمر کے کئی نابینا بچوں کو قبضہ میں لے چکی تھی اور مختلف شہروں سے کئی فرشتہ صورت حافظوں کو گرفتار کر بیٹھی تھی۔

جج نے اپنی ساری توجہ اس مقدمے پر لگا دی۔ سماعت شروع ہوئی۔ نوجوان نے بیان دیا۔

”حافظ جی مجھے اپنا بیٹا بتاتے تھے۔ بچپن میں تو میں بھی یہی سمجھتا رہا لیکن جُوں جوں عمر بڑھتی گئی' توں توں میرا یہ احساس پختہ ہوتا گیا کہ یہ جھوٹ ہے۔ میں حافظ جی کا بیٹا نہیں ہو سکتا............ میرے تصور میں ہمیشہ ایک خواب رینگتا' جیسے ایک چھوٹی سی حویلی ہو۔ وہاں انگور کی ایک بیل ہو۔ ایک کنج میں نیاز بو کے کچھ پودے ہوں۔ لڑکھتے ہوئے پستانوں والی ایک کتیا ہو اور پانچ چھ پلے اس کے پستانوں سے لگے شڑپ شڑپ دودھ پی رہے ہوں............ اور ایک چھوٹا سا بچہ ہو جو کبھی انگور کی بیل پکڑ کر کھڑا ہو جائے اور کبھی نیاز بو کے پودوں میں الجھ جائے اور کبھی وہ بچہ ان پلوں میں مل کر کتیا کے پستانوں کو منہ میں ڈالنے کی کوشش کرے اور وہ کتیا منہ پھیر کر خاموش اور معصوم نگاہوں سے اسے دیکھتی رہے............

”پھر اچانک کوئی عورت چولھے میں توے پر کچی روٹی چھوڑ کر بھاگ آتی ہو۔ کتیا کو دھتکار کر بچے کو سینے سے لگا لیتی ہو اور ایک پیار بھرے ہلکے سے چپت کے ساتھ اپنا پستان اس کے منہ میں ڈال دیتی ہو............ پھر جیسے یہ سپنا یہیں ٹوٹ جاتا ہو۔ اس سے آگے میرے تصور پر ایک دھند سی چھا جاتی ہے۔ اس دھند میں سب سے پہلا چہرہ حافظ جی کا دکھائی دیتا ہے............ حافظ جی مجھ سے بڑا لگاؤ رکھتے' پر نہ جانے میرے سینے میں ان کی محبت کا دیا کیوں نہ جلا۔ وہ جو کھاتے مجھے کھلاتے۔ میری خوشنودی کا بے حد خیال رکھتے لیکن وہ جو اعتماد کی ایک روشنی ہوتی ہے' وہ پیدا نہ ہو سکی............ مجھے سب کچھ فریب نظر آتا............ شاید چھ سات یا آٹھ نو برس کی عمر سے میں حافظ کو سہارا دے کر گھر سے بازار اور بازار سے گھر لے آتا اور اس کے علاوہ کئی اور اندھے بچوں کو اپنے اڈوں پر پہنچاتا اور پھر شام کو واپس انہیں اپنی رہائش گاہ پر پہنچاتا ....

”لیکن مجھے صحیح یاد نہ آتا کہ یہ کام میں نے کب شروع کیا ہے۔ اس کا آغاز میری عمر کے کونسے حصے سے ہوا لیکن جہاں میرا وجدان حافظ جی کو اپنا نہ کہہ سکا' وہاں عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ وہ فطری معصومیت دبتی چلی گئی اور ماحول کی معصیّت کا میں عادی ہوتا گیا............ حافظ جی کا طریقِ کار میرے ذہن پر حاوی ہوتا گیا اور میں سمجھتا رہا' ساری دنیا کا دھندا یوں ہی چلتا ہو گا .... اور پھر عمر کے تقاضوں کے ساتھ میرے ہر تقاضے کو پورا کیا جاتا رہا............ میں خوش تھا' ہر طرح مطمئن تھا............ حافظ جی کا کاروبار بہت پھیلا ہوا تھا............ وہ چار پانچ برس کے بچوں کو پکڑ کر لاتے' ان سے بڑا پیارا سلوک کرتے۔ پھر ان کی آنکھوں میں کوئی دوا لگا دیتے' جس سے ان کی آنکھیں پہلے تو یکدم سرخ ہو جاتیں پھر ان میں پھنسیاں نکل آتیں۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتے میں زخم ٹھیک ہو جاتے مگر لڑکے ہمیشہ کے لئے اندھے ہو جاتے............

”پھر ایک مہینے تک ان کو تربیت دی جاتی۔ اس تربیت میں مار پیٹ اور پیار سب شامل ہوتا۔ جب وہ حافظ جی کے معیار پر پورا اترتے تو پھر میرا کام شروع ہو جاتا۔ حافظ جی کے مقرر شدہ اڈوں پر انہیں پہنچایا جاتا۔ وہ بیٹھے بیٹھے یا لیٹے لیٹے بھیک مانگتے پھرتے۔ شام کو میں انہیں واپس لاتا۔ ہر ایک چار پانچ روپے کما لاتا............ لیکن یہ کام اتنی احتیاط سے کیا جاتا کہ رازوں کو سونگھنے والے بھی اس کا پتہ نہ لگا سکتے۔ دس سے زیادہ لڑکے حافظ جی نہ رکھتے۔ وہ کہا کرتے' اس شہر میں اتنی ہی کھپت ہو سکتی ہے، اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں............! اور جب ان میں سے کوئی جوان ہو جاتا' تو حافظ جی انہیں چھٹی دے دیتے اور کہتے..........

”بھئی اب تم جوان ہو گئے ہو' جاؤ خود کماؤ اور عیش کرو!“

اگر میں کہتا۔

”حافظ جی! کیا حرج ہے' ابھی تو کما کر لا رہا ہے۔“

تو فرماتے۔

"نذر بیٹا' کاروبار کا زیادہ پھیلانا اچھا نہیں ہوتا۔ بس اتنا جس پر کنٹرول کیا جا سکے اور پھر نوجوان آدمی پر زیادہ بھروسہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ ملک آباد ہے' بچوں کی یہاں کونسی کال کمی ہے!"

حافظ جی ایک احتیاط اور بھی برتتے۔ اس شہر کے بچے کسی اور شہر میں بھیج دیتے اور وہاں کے بچوں سے یہاں کام لیتے اور پھر تربیت کے وقفے میں ان کے حلیے اتنے بگاڑ دیتے کہ مائیں بھی اپنے لال نہ پہچان سکتیں............ ان کا کاروبار یہاں کے علاوہ ملک کے سارے بڑے بڑے شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ بچوں کو نابینا بنا کر اپنے ایجنٹوں کو بھیج دیتے یہ کام میرے ذمے ہوتا۔ دو ڈھائی سو تک بچہ بک جاتا............
کئی خوش نصیب بچے ایسے بھی ہوتے جو اندھے ہونے سے بچ جاتے۔ ایسے بچوں کی مانگ بھی بہت تھی۔ آنکھوں والے بچوں کی قیمت تین اور چار سو تک ملتی۔ حافظ جی بتاتے۔

"یہ کماتے تو ایسے ہی ہیں۔ انہیں گرہ کٹ اور جیب تراش بنا دیا جاتا ہے اور یہ ایک ہی وار میں ہزاروں کا داؤ پھینکتے ہیں"۔

ایک روز حافظ جی ایک بچہ لائے۔ بہت حسین' بہت خوبصورت' بہت بھولا اور بہت معصوم............ اس کی عمر یہی چار ساڑھے چار برس ہو گی............ یہ بچہ طوطی کی طرح چہکتا تھا اور بھنورے کی طرح حافظ جی کے گرد منڈلاتا۔

"بابا اب مجھے چھوڑ آؤ نا، دیر ہو جائے گی تو امی ڈانٹیں گی"۔

حافظ جی ہنس پڑتے۔

"نہیں بیٹا' ان سے پوچھ کر ہی تو لایا ہوں تجھے"۔

اور پھر مجھے آواز دیتے۔

"جا بیٹا کاکے کے لئے مٹھائی لے آ۔"

بچہ مٹھائی پا کر سب کچھ بھول جاتا لیکن کچھ دیر بعد پھر ضد کرنے لگ جاتا۔

"میں جاؤں گا' میں جاؤں گا۔ ابا بھی گھر اب آ گئے ہوں گے"۔

اور شام کو تو اس کا اصرار اتنا بڑھا کہ زمین پر ایڑیاں رگڑنے لگا۔

حافظ جی نے تڑاخ سے ایک تھپڑ رسید کیا۔

"جا سو جا............!"

بچہ لڑکھڑا کر دو تین قدم دور جا پڑا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ ڈرتے ڈرتے کانپتے کانپتے اٹھا اور سہمی ہوئی آنکھوں سے حافظ جی کو دیکھنے لگا۔

"جا سو جا۔!"

حافظ جی کے لہجے میں رعب اور دلاسہ دونوں تھے۔ بچہ بوٹوں سمیت سو گیا۔ نیند میں بھی اسے ہچکیاں آتی رہیں۔

پہلی بار میرا ذہن ساری رات اس کشمکش میں الجھا رہا۔

دوسرے دن بچے پر عمل جراحی کیا گیا۔ اس کی آنکھیں سوج گئیں۔ وہ سارا دن روتا رہا۔ تین روز تک جھٹکے جھٹکے رویا، آخر تھک گیا اور اسے صبر آ گیا۔ اب اسے گھر جانے کی بجائے ہروقت آنکھوں کا خیال رہتا۔

"کیوں بھائی' میری آنکھیں کب ٹھیک ہوں گی؟؟"

میں اسے دلاسہ دیتا۔

"بس چار پانچ روز میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی ننھے!"

چند روز بعد اس کے زخم ٹھیک ہو گئے تو وہ مکمل اندھا ہو چکا تھا!

حافظ جی سے وہ بہت ڈرتا۔ جب تک اس کی آواز سنتا' کچھ نہ بولتا لیکن جب اندازہ کر کے محسوس کرتا کہ حافظ جی چلے گئے ہیں تو ڈرتے ڈرتے بے حد محتاط لہجے میں بولتا۔

"بھائی..........!"

اور جب میں اثبات میں جواب دیتا تو کہتا۔

"بھائی مجھے دکھائی کیوں نہیں دیتا؟"

اس کا اندازِ تخاطب اتنا درد بھرا ہوتا کہ میں لرز لرز جاتا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اب زیادہ دیر تک اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکوں گا۔ اس واقعہ کو تقریباً پندرہ دن ہو چکے تھے۔ میں ایک ہوٹل میں بیٹھا فلمی گیتوں کے ریکارڈ سن رہا تھا کہ اچانک اناؤنسر نے اعلان کیا۔

"ایک بچہ جس کا نام نعیم ہے۔ عمر چار سال۔ گورا چٹا رنگ۔ ہرے رنگ کی ریشمی قمیض اور نیکر پہنے ہے۔ پاؤں میں سیاہ بوٹ۔ سر کے بال بھورے۔ تقریباً پندرہ دن سے گم ہے جو صاحب بھی بچے کا سراغ لگائے گا یا بچے کو لائے گا، اسے دو ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔"

اعلان سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ بالکل وہی بچہ تھا۔ میں سیدھا اپنے اڈے پر لوٹ آیا۔ اس مخصوص کمرے کا دروازہ کھولا' جس میں ایسے بچے رکھے جاتے تھے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے سر جھکائے کسی بڑے مفکر کی طرح سوچ رہا تھا۔ کچھ لمحے خاموش کھڑا میں اسے دیکھتا رہا.......... مجھے اپنا کلیجہ پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ کوشش کے باوجود میں اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا.......... زندگی میں پہلی بار میرے آنسو کسی کے درد سے متاثر ہو کر نکلے تھے۔ میرا دل دہل گیا۔

"یااللہ' تیری خدائی میں ایسا بھی ہوتا ہے اور تو اسے دیکھتا ہے' برداشت کرتا ہے۔ تیری اس خدائی کو بیس برس سے تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔"

"نعیم..........!"

میں نے رندھے ہوئے گلے سے اسے آواز دی۔

"جی۔"

وہ چونک پڑا۔ اس کا جھکا ہوا سر اٹھ گیا۔ میں اس کے اور قریب آ گیا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو نعیم؟"

وہ بڑی سادگی سے مسکرایا۔

"بھائی.......... مجھے للّو یاد آ گیا تھا۔"

"للّو..........! وہ کون ہے تمہارا؟"

"واہ.......... آپ اسے نہیں جانتے۔" اس نے بڑی معصوم حیرت کا اظہار کیا.......... للّو میرا چھوٹا بھائی ہے۔ بڑا شریر ہے بھیا۔ ہر وقت مجھے گھوڑا بنایا کرتا تھا اور میرے منہ میں لگام ڈال دیتا تھا۔ پھر اوپر چڑھ بیٹھتا تھا اگر میں نہ بھاگتا تو سچ مچ مارنے لگ پڑتا۔ اب کے جاؤں گا تو ایک دم ضد کرے گا، نمو پاپڑ نہیں لایا' نمو پاپڑ نہیں لایا!!"

وہ اپنی موج میں آ کر للو کی کہانی سنائے جا رہا تھا اور میری آنکھوں سے چشمہ رواں تھا۔ للو تک پہنچنے کی تمنا ابھی تک زندہ تھی۔

"نعیم..........!" میں نے آواز میں قدرتی پن پیدا کرنے کی کوشش کی.......... "تمہیں للو کے پاس چھوڑ آؤں؟"

"وہ تو میں چلا جاؤں گا بھیا لیکن میری آنکھیں ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئیں۔ آپ کہتے تھے نا جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔ اسے جلدی سے ٹھیک کر دیں بھیا.......... یا پھر ایسا کریں للو کو بھی یہیں لے آئیے یا پھر میں ہی چلا جاؤں گا!"

میں اس بے سروپا معصومیت کو برداشت نہ کر سکا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے اسے سینے سے چمٹا لیا۔ اس کی وہ چند لمحے پہلے کی ساری خوشی میرے آنسوؤں میں بہہ گئی۔ وہ پریشان سا ہو گیا۔

"آپ روتے کیوں ہیں بھائی..........؟"

اس نے احتجاج کیا۔ بھائی یا بھیا وہ ضرور بولتا۔ میں نے اسے اور زیادہ بھینچ

لیا۔ مجھے رونے میں بے حد لطف آ رہا تھا.......... عجیب لطف تھا یہ، عام مسرتوں سے انوکھا سا کیف تھا اس میں.......... وہ بھی خاموش ہو گیا مگر اس خاموشی میں کائنات کی ساری لطافتیں گھل مل گئی تھیں۔ اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ اس لمحے میں خود کو دنیا کا نہیں، کسی آسمانی مخلوق کا فرد سمجھ رہا تھا.......... ایک عاصی روح ایک معصوم روح کے ساتھ سمجھوتے پر سربسجود تھی.......... آنسوؤں کا جو سرمایہ میرے پاس تھا، وہ لٹ چکا تھا اور غالباً یہی تہی دامنی میری ذہنی تونگری کا باعث بھی بنی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ پوری برداشت سے واقعات کا مقابلہ کروں گا۔

شام کو حافظ جی واپس آئے، تو میں نے کہا.......... "حافظ جی یہ لڑکا جو اپنے پاس ہے نا، اس کے تو دو ہزار مل سکتے ہیں!"

حافظ جی جھٹ بولے۔

"جانے بھی دو بیٹا، اتنا لالچ بھی کیا۔ سانپ کے منہ میں چھچھوندر والی بات ہے جو نہ اُگلے نہ نگلے۔ دو ڈھائی سو مل جائیں گے، کافی ہیں۔ کل اس کا بندوبست کر دو۔ وہ لوگ منتظر ہوں گے!"

کھانا کھانے کے بعد میں نے حافظ جی کو پھر ٹٹولا۔

"حافظ جی! یہ راستہ جس پر ہم جا رہے ہیں، کہاں ختم ہوتا ہے۔ اس پر بھی سوچا ہے کبھی آپ نے؟"

حافظ جی چونک پڑے اور بے حد نرمی سے بولے۔

"آج کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹا۔ دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے، یہ تم نے دیکھا ہی نہیں۔ ہم تو ان کی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ تاریخ گواہ ہے، ڈاکوؤں نے انسانوں کی کھوپڑیوں کے محل تعمیر کروائے اور بادشاہ بن بیٹھے۔ اور پھر دور کیوں جاتے ہو بیٹا، اپنے اور ہمسایہ ملک میں مذہب کے نام پر کیا کچھ نہیں ہوا۔ جوان بہنوں اور بیٹیوں

کی چھاتیاں کاٹ دی گئیں۔ بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر چیر دیا گیا اور اپنا تو صرف دھندا ہے پیٹ پالنے کا۔ اس سے زیادہ ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے!"

میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ انسان اپنے مظالم اور سیاہ بختی کے جواز کے لئے کیسی کیسی راہیں ڈھونڈتا ہے.......... حافظ جی کو میرے تغیر پر شک بھی اور رنج بھی ہوا تھا۔ ان کی پریشانی کو میں بھانپ گیا تھا۔ ایک دو دن ڈھیل دینے سے شاید وہ اس پریشانی کا بھی خاتمہ کر دیتے لیکن میں اب چوکنا ہو گیا تھا.......... رات وہ کروٹیں بدلتے رہے۔ ایک بار میری چارپائی کی طرف سر اٹھا کر دیکھا اور بولے۔

"کیا سو گئے بیٹا..........؟"

"نہیں حافظ جی، آج تو نیند نہیں آ رہی۔ سر میں ہلکا ہلکا درد ہے۔"

"تو پھر کچھ دوا وغیرہ کھا لیتے بیٹا"۔

"صبح کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا حافظ جی۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔

"میرا کیا ہے بیٹا۔ آدھی گزر چکی ہے، آدھی باقی ہے۔ وہ بھی جوں توں کر کے گزر جائے گی جو کچھ کر رہا ہوں، تمہارے لئے۔ کل تم ہی سکھی رہو گے!"

حافظ جی رات کو عموماً باہر رہتے اور صبح تڑکے سے پہلے پہنچ جاتے۔ ہفتے میں ایک آدھ بار ہی گھر پر سوتے۔ کام دھندا ہی ایسا تھا کہ میں نے ان کی غیر حاضری پر کبھی غور نہیں کیا.......... صبح ہوئی۔ میں نے حافظ جی کو روز کے ٹھکانے پہنچایا۔ واپس آنے لگا تو انہوں نے دوبارہ ہدایات دیں۔

"بیٹا اس لڑکے کا انتظام کر چھوڑنا اور وہ پڑوس میں غفورے کے لڑکے کو کہہ دینا تین چار روز کے لئے مجھے سہارا دے دیا کرے۔"

میں ہاں کر کے چلا آیا۔ نعیم کے گھر کا پتہ ریڈیو سے معلوم ہو چکا تھا۔ اس کا

منہ ہاتھ دھو کر میں نے اس سے کہا۔

"نعیم! آج تمہیں للّو کے پاس لے جا رہا ہوں۔"

خوشی سے اس کی پلکیں تیز تیز جھپکنے لگیں۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔

بھائی وہ تو پاپڑ کے لئے روئے گا' پاپڑ بھی لے چلنا!"

میں سمجھا تھا' میں آنسوؤں کا خزانہ ختم کر چکا ہوں لیکن نہ جانے میرا دل کیوں بھر آیا۔ میری آنکھیں پھر بہنے لگیں۔ میں نے اسے چوم لیا۔

"اچھا پاپڑ بھی لے چلیں گے۔"

مگر میں اپنی آواز کی رقت نہ چھپا سکا۔ اس کے تبسم چہرے پر تفکر کی ایک لہر پھر رقص کر گئی۔

"بھائی آپ رونے کیوں لگ جاتے ہیں!"

"نہیں تو............ دیکھو میں ہنس رہا ہوں۔"

"میں یونہی ہنس پڑا۔ وہ مطمئن ہو گیا اس کے سر پر تولیہ ڈال کر سائیکل پر بٹھایا۔ بازار سے پاپڑ خریدے اور پھر ایک گلی میں پہنچ کر ایک بڑے پھاٹک کے سامنے خاموشی سے اتار دیا اور پاپڑ اس کے ہاتھ میں تھمادیئے پھاٹک تک پہنچنے میں مَیں نے ہر مجرمانہ احتیاط برتی۔ میں جانتا تھا' والدین کو بچہ مل جانے سے جو خوشی ہو گی' وہ خوشی اس درد اور اذیت کا ہزارواں حصہ بھی نہ ہو گی جو بچے کے سفید ڈیلوں اور بے نور آنکھوں کو دیکھ کر پیدا ہو گی لیکن............ میں مجبور تھا۔ مجھے انہیں یہ دکھ پہنچانے میں روحانی اور قلبی کوفت کے ساتھ ساتھ ایک ڈوبتی ہوئی مسرت کا بھی احساس ہو رہا تھا............ نعیم للو کو پاپڑ کھلا سکے گا' میرے لئے یہ اطمینان بہت تھا۔ بہت زیادہ............

"میں نے اس سے کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھی۔ سائیکل پر بیٹھ کر تیزی سے لوٹا۔ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے چیخ و پکار کا ایک طوفان میری طرف بڑھا لیکن دوسرے

لمحے بازار کی ریل پیل نے مجھے محفوظ کر دیا تھا اور پھر کچھ دیر بعد میرے چاقو نے حافظ جی کے ڈیلے باہر نکال پھینکے۔ میں نے ان کا سینہ چھلنی کر دیا۔ میں نے اس اندھی روح کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔!!"

نوجوان قاتل کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ اس کا جوش بیان قابل دید تھا۔ جج اور حاضرینِ عدالت پر سناٹا طاری تھا۔ نعیم باپ کی گود میں عدالت کے ایک گوشے میں خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ بدل رہے تھے۔ تماشائیوں کی پلکوں پر آنسو تیر رہے تھے۔

نوجوان کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔

"ایک بات میں بھول گیا ہوں' حافظ جی اندھے نہیں تھے۔ وہ دن کو گھر سے نکلتے وقت آنکھوں میں کوئی دوا لگا لیتے جس سے ان کی آنکھیں چپک جاتی تھیں............ بس---- میرا قصہ ختم ہو چکا ہے۔ قانون مجھے کس سلوک کا مستحق سمجھتی ہے............ نہیں جانتا لیکن............ میں اس پاپیوں کی دنیا میں رہنے کے لئے تیار نہیں۔ میں اپنی زندگی کا ماحاصل پا چکا ہوں۔ اب زندگی سے رشتہ توڑنے پر مجھے قطعی افسوس نہ ہو گا............!!!"

دوسرے دن اخباروں میں جلی سرخیوں سے حافظ جی کا نکاح نامہ شائع ہوا۔ درحقیقت یہ نکاح نامہ ایک وصیت نامہ بھی تھا۔

دونوں کے کاروبار کے تحفظ کے پیشِ نظر یہ شادی راز میں رکھی گئی تھی۔

"آفتاب بائی آئندہ کسی قیمت پر بھی پیشہ نہیں کرے گی۔ صرف گانا سننے والے گاہکوں کو رسمی خوش آمدید کہے گی۔ رات کے ایک بجے کے بعد کوئی گاہک نہیں ٹھہرے گا۔ گھر کے سارے اخراجات حافظ نذیر احمد برداشت کریں گے۔ گانے کی کمائی ہوئی دولت سے حافظ نذیر احمد کا کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ موہن روڈ والا فلیٹ جس کی قیمت بارہ ہزار روپے ہے' حق مہر کے طور پر آفتاب بائی کی ملکیت میں رہے گا۔ مارفی

بنک کا آٹھ ہزار کا اکاؤنٹ شادی کے تحفہ کے طور پر آفتاب بائی کے نام منتقل کر دیا گیا۔ حافظ نذیر احمد کا ذاتی مکان اور قومی بنک کا اٹھارہ ہزار کا اکاؤنٹ دونوں کے ہونے والے بچے کی ملکیت ہو گی............. آفتاب بائی کسی صورت میں طلاق لینے کی مجاز نہ ہو گی اور حافظ نذیر احمد کو دوسری شادی کا اختیار نہ ہو گا!

راجی

سردیوں کی سیاہ کالی رات.............

اور وہ سو رہا تھا' گہری اور میٹھی نیند............. سوکھی لکڑیوں کے جلنے کی تڑتڑاہٹ اور بچوں' عورتوں کے شور و غل سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ پڑوس کے ایک جھونپڑے میں آگ لگ گئی تھی۔ پاؤں میں چپل پہنے بغیر' وہ دروازے کی کنڈی کھول کر دوڑ پڑا۔ گلی کی نکڑ پر ایک دوسرے کی ٹکر ہو گئی۔ دونوں گر پڑے لیکن گرتے گرتے غیرارادی طور پر ایک دوسرے کا سہارا لیا۔ سہارے نے دونوں کو گتھم گتھا کر دیا۔

دونوں نے ایک عجیب سی حرارت محسوس کی۔

"یہ آگ کیسی.............؟"

لمحہ بھر دونوں خاموش رہے لیکن جلد ہی زندگی کے احترام نے اس اتفاقی سمجھوتے کا سحر توڑ دیا۔

"ارے کون ہو تم............؟" سعید نے بس یونہی کہہ دیا۔

وہ چپ رہی............ اس کے پاس بھلا کیا جواب تھا۔

آگ کے شعلے ہیولوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ ان شعلوں کی ہانپتی تھرکتی روشنی دونوں کے چہروں پر پڑی تو سعید جھنجلا اٹھا۔

"راجی............! .... تم!!"

راجی مسحور اور سہمی ہوئی آنکھوں سے اسے تک رہی تھی۔ اس کا انداز تو اتنا نیا اور عجیب تھا کہ سعید دوسرا سوال نہ کر سکا۔ چپ چاپ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا............ راجی کھڑی رہی۔ سعید بوجھل بوجھل قدموں سے آگ کی طرف بڑھا۔ راجی نے آگ بجھانے کا خیال چھوڑ دیا۔

وہ واپس چلی گئی۔

سعید کے پہنچنے سے پہلے ہی آگ پر قابو پایا جا چکا تھا۔ شعلے ختم ہو چکے تھے۔ جلی ہوئی گھاس اور جلی ہوئی لکڑیوں سے جلے ہوئے دھوئیں کی بدبو اٹھ رہی تھی۔ ہر ایک بڑھ بڑھ کر اپنی کارکردگی بیان کر رہا تھا۔

"اگر جھونپڑا گرا نہ دیتے تو آگ مکانوں تک پہنچ جاتی"۔

دوسرا کہتا۔

"اچھا ہوا، پانی کا جوہڑ قریب تھا"۔

تیسرے نے کہا۔

"ایک کی آہ۔ سب کی پھونک' سب نے ہمت کی' ورنہ سارا گاؤں جل جاتا۔!"

عورتیں الگ اپنے اپنے بچوں کو چھاتیوں سے لگائے آگ لگنے کی وجہ پر چہ میگوئیاں کر رہی تھی۔ راجی واپس جا چکی تھی............ سعید کو جلا ہوا دھواں اچھا نہ

۔ وہ بھی گھر لوٹ آیا۔

راجی گاؤں کی چھبیس سالہ کنواری تھی۔ بدبختیاں ایک دو ہوتیں تو کوئی بات نہ نی۔ گنی ہوئی بدنصیبیاں تو آدمی ہمت کر کے روند سکتا ہے لیکن اس کا تو وجود ہی ریکیوں کا سایہ تھا............ نہ ماں' نہ باپ سب مرکھپ گئے تھے۔ بچپن سے یتیم یسر............ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ جہاں بھی جھوٹا بچا مل جاتا' پیٹ بھر تی............ کبھی کبھی انسان اس لئے بھی زندہ رہتا ہے کہ پرایوں کے طنز اور ظلم کو ندگی دے سکے۔

زیادتی' جبر اور زبردستی کو کوئی حقیقت نہ سمجھے تو پھر خلوص اور محبت کی بھی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی............! یہی نہ تھا' راجی بے چاری قبول صورت ہوتی تو تنے برس تک کنواری اور عفت مآب کیونکر رہتی............ زبردستی کا کنوارپنا' ؤامخواہ کی عصمت شعاری بوجھ ہی نہ تھی۔ گناہ تھا یہ تو............!

گناہ کس کا تھا............؟

اس حقیقت کو سعید پا رہا تھا۔ پائی نہ تھی اس نے' بس ڈھونڈ رہا تھا............

اسے تو بڑی آسانی سے گاؤں کا سب سے اچھا رشتہ مل سکتا تھا۔ وہ گاؤں کا واحد نوجوان تھا' جس نے مڈل کی حدود پھاند کر اور قابلیت کا وظیفہ لے کر شہر میں تعلیم پائی تھی اور تعلیم بھی ایسی............ کہ تعلیم کی موجودہ وسعت اور اثر میں الجھنے کی بجائے اس کا مزاج بہت حد تک سلجھ گیا تھا۔ یہ بھی شاید اس کی ذاتی صلاحیتوں کی وجہ تھی۔

گاؤں کے سب جوان بوڑھے اس کا احترام کرتے تھے اور بستی کی بہت سی لڑکیوں کے دلوں میں اس کی چاہت تھی۔ ہر ایک کی عقیدت میں ایک رنگ تھا............ کوئی ٹھوس اور کوئی چاند کی کرنوں کی طرح نرم............ عقیدت کا یہ ہالہ چاروں طرف روشن تھا۔ سعید اس احترام کا ہر روپ جانتا تھا۔

لیکن آج راجی کی سہمی ہوئی آنکھوں نے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ عارضی سمجھوتہ جو دو جوان جسموں کے تصادم سے ہوا تھا' اس میں کچھ معنی تھے اور اس کے انتشار میں ایک ٹھہراؤ سا تھا............ وہ جو بدبختی اور بدصورتی والی بات تھی' وہ تو بات کا ایک پہلو تھا۔ ایسا پہلو جو نظر آ سکے اور نظر انداز بھی ہو سکے۔ جسے اپنانے یا نہ اپنانے میں دکھ اور احساس کی دونوں صورتیں عارضی ہوں............

لیکن راجی کا اندازِ نظر تو بالکل نئی چیز تھی۔ اس میں ایسی انوکھی بات تھی جو ضمیر کے تمام بلند بانگ دعوؤں کو مرعوب کر سکے............ ایسا گریز جو پابہ زنجیر ہو۔ ایسی فراریت جو منجمد ہو گئی ہو لیکن جس کے انجماد میں آگ سے زیادہ جلانے کی قوت ہو............ اس کا مطالعہ اس کا مشاہدہ برسرِپیکار تھا۔ اس کی زندگی کا سارا خلوص سارا سرمایہ آج ایک حقیقت سے ٹکرا گیا تھا۔ اس ٹکر کی گونج میں ایک ایسا ارتعاش تھا' جس سے اس کے جسم کے سارے تار جھنجھنا رہے تھے!

راجی بھی آگ بجھانے آئی تھی لیکن پھر کھڑے کھڑے واپس کیوں چلی گئی............؟

............؟ یہ سوال ریاضی کے ہر سوال سے پیچیدہ اور فلسفے کی ہر قدر سے زیادہ عمیق تھا۔ سعید رات بھر اپنے آپ سے الجھتا رہا۔

راجی بھی نہ جانے صبح تک کتنے سپنے دیکھ چکی تھی۔ سوتے اور جاگتے میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ ایک ہی قسم کے وسوسے تھے۔ چبھتے ہوئے کراہتے ہوئے............ بس ایسے جن کی چبھن اچھی لگے جن کی موت کا احساس تکلیف دہ ہو۔

سعید نے اس کا نام پکارا تھا۔

"راجی............ تم!!"

اسے تو بچے بھی براجی کہتے تھے۔ کبھی کوئی ایسی بات ہی نہ ہوئی تھی' جس سے

وہ راجی کے معنی پر غور کرتی۔ وہ تو بس ایک نام تھا جو چھبیس سال میں نہ جانے کتنی بار پکارا گیا ہو گا............ سختی سے' نرمی سے' گالی کے طور پر' طنز کے انداز میں............ لیکن اس نے اس پر کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ توجہ کی بات ہی نہیں تھی۔ اس کا نام ہی تو تھا جو جیسا چاہے پکارے لیکن............ آج کیا بات تھی۔ راجی میں اتنی وسعت کہاں سے آ گئی تھی............ "راجی............! تم!!"

سعید نے راجی اور تم میں اتنا فاصلہ کیوں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے "جی" کو دبا کر اس پر اتنا بوجھ کیوں ڈال دیا تھا............ "تم" کہہ کر اس نے ایک سوال کی حیثیت کیوں دیدی تھی............ اس فاصلے میں تو منزل کی تلاش کی ایک گونج تھی۔ اس "جی" کو لتاڑنے میں بھی ایک زندگی تھی اور اس "تم" میں بہت ساری باتوں کا جواب تھا............ گویا وہ تم کہنے سے پہلے بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ بہت کچھ پایا...... تھا' ورنہ میں تو وہی راجی تھی۔ جسے وہ دن میں کئی بار دیکھتا ہے اور وہ دیکھنا نہ دیکھنے کے برابر ہوتا ہے لیکن آج............ اس "تم" کی حیرت نے مجھے نئی لڑکی بنا دیا ہے۔ میں انوکھی اور نئی نہ تھی تو اتنی حیرت کی وجہ کیا تھی............؟

پھر اچانک اس کے انوکھے پن کو ایک نئی مایوسی نے ڈس لیا۔ شاید وہ کسی اور کا تصور کئے بیٹھا ہو اور جب یہ تصور حقیقت بن کر راجی کی شکل میں سامنے آ گیا ہو تو اس حیرت نے جنم لیا ہو............ لیکن پھر فوراً ایک اور خیال نے تریاق بن کر مایوسی کے اس زہر کو چوس لیا۔

اس نے سعید کے بوجھل بوجھل قدم اپنے سینے پر دبتے ہوئے محسوس کئے............ وہ آگ بجھانے جا رہا تھا یا پیچھے کی آگ کی تپش محسوس کر رہا تھا۔

دونوں طرف آگ تھی۔ آگے بھی' پیچھے بھی۔

کسے چھوڑے کسے بجھائے............ ؟

وہ کوئی بھی آگ نہ بجھا سکا تھا۔ ایک آگ اس کے پہنچنے سے پہلے بجھ گئی تھی

اور دوسری آگ اس کے بھاری بھاری قدموں سے لپٹ کر سارے جسم میں پھیل گئی تھی!!

راجی کے اس سہارے میں بڑی جان تھی۔ وہ سعید کے جسم میں پھیلی ہوئی آگ کی حرارت کو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ اس کی تاریک کٹیا آج ساری رات ان لپکتے تھرکتے شعلوں سے فیروزاں رہی!

صبح اٹھ کر نہ جانے کس ارادے سے اس نے پرانی ٹوکری کی تمام غیر ضروری چیزیں الٹ پلٹ کر کے آئینے کا وہ ٹکڑا نکالا، جو نمبردار کے گھر کے سامنے چھوٹی بچیاں کھیلتے ہوئے بھول آئی تھیں اور وہ اٹھا لائی تھی............ جس کی پشت سے گیروے رنگ کی پالش جگہ جگہ سے اتر گئی تھی اور جو خراشیں پڑ پڑ کر اور گھس گھس کر اندھا ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اس میں ایک آدھ جگہ سے چہرے کا کوئی زاویہ نظر آ جاتا تھا۔ پھیکا پھیکا، مٹا مٹا............ اور جسے مہینے میں ایک آدھ بار نہا کر وہ باری باری سے ناک، آنکھ، رخسار، منہ اور دانت وغیرہ دیکھ لینے کے لئے استعمال کر لیا کرتی تھی۔

آج اس نے ٹیڑھے ترچھے نوکدار زاویوں والے ٹکڑے کو ہاتھ میں اٹھا لیا تو وہ عام احتیاط بھی بھول گئی۔ اپنا بھدا چہرا دیکھنے سے پہلے ہی اس کی ہتھیلی میں ایک نوک چبھ گئی۔ سرخ خون کا ایک ننھا سا قطرہ ہتھیلی پر چمکنے لگا۔ وہ مسکرائی اور بے اختیاری انداز میں ہتھیلی کو دانتوں سے کاٹ لیا۔ خون اس کی زبان سے لگا۔ عجیب ذائقہ تھا۔ بالکل نمکین سا............ اسے بُرا نہ لگا۔ وہ ہنس پڑی۔

آئینے میں اپنی پوری شکل نہ دیکھ سکی۔ ورنہ نئے احساسات کے کئی روپ دیکھ لیتی............ حجاب شرمانا لجانا عورت کے حسن کا ایک حصہ ہوتا ہے لیکن راجی اس فطری جھجک اور شرم سے محروم تھی۔ محروم تو شاید نہ تھی لیکن ماحول کی محرومی نے اس سے یہ سب کچھ چھین لیا تھا اور چھبیس سالہ کنوارپنے نے اس فطری جھجک پر ایک سادہ اور بے کار سی معصومیت کا غلاف چڑھا دیا تھا۔

کوئی ایسی نگاہ ہی نہیں تھی، جس نے اس جمود کو توڑا ہوتا۔ کوئی ایسی ادا ہی نہیں تھی، جس نے اس کے ماحول کو چھیڑا ہوتا۔ اس کے دامن میں کئی بھونچال آتے رہے لیکن وہ باہر کی بجائے اس کی ہی دنیا کو پامال کرتے رہے اور جب درد لادوا ہو گیا تو جمود ہی زندگی بن گئی۔

لاکھوں من بوجھ سے دبے ہوئے جذبے کو آج ہوا راس آئی تھی۔ موقع و محل موزوں پا کر بیج پھوٹ پڑے تھے اور آج آئینہ میں پوری طرح اپنے تاثرات نہ دیکھ سکنے کے باوجود وہ فطرت کی بیٹی بن گئی تھی۔ اسے اپنی ادائیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ من کی آنکھوں سے اندر کے جوار بھاٹے کا عکس اپنے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔

تمنا جو سو گئی تھی، اچانک جاگ اٹھی تھی۔

وہ دن بھر آج گھر میں قید رہی۔ اس نے خود کو قیدی بنا لیا تھا۔ وہ روزانہ سارا سارا دن گلیوں اور گھروں میں آوارہ کتیا کی طرح گھومتی۔ دن اور رات کے معمول کی طرح اس کا ہر روز ایک جیسا ہوتا۔ زندگی کی یکسانیت کی وہ عادی ہو گئی تھی۔ پتھر کی طرح امید سے خالی زندگی............ وہ زمین پر ایک بوجھ تھی۔ اسے سب دیکھتے۔ سب کو دیکھتی لیکن جس طرح نگاہیں زمین سے اٹھ کر آسمان کو دیکھ لیتی ہیں اور خلاؤں کو کوئی نہیں دیکھتا، اسی طرح دنیا کی نگاہیں راجی کو نظرانداز کر کے باقی سب کچھ دیکھ لیتی تھیں۔

نظرانداز ہونے کی صورتِ حال نے راجی سے سب کچھ چھین لیا تھا۔

لیکن آج اسے اپنے وجود کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے جسم میں سانسیں اوپر نیچے ہو رہی ہیں۔ وہ زندہ ہے۔ وہ ایک عورت ہے اور ایک انسان بھی۔ تبھی آج وہ قیدی بن گئی تھی۔

انسان ہونے کا احساس بھی کتنا عجیب ہے............ کسی اور شکل میں محصور

ہونا کون پسند کرے گا۔ پاؤں میں زنجیریں بھی کبھی کبھی زندگی کا مقصد بن جاتی ہیں۔

وہ قید تھی لیکن اس کا تصور آزاد تھا۔ اس کا جسم گھر پر تھا مگر اس کا ذہن سب دنیا کی خبریں لا رہا تھا۔ گاؤں کی ہر گلی ہر موڑ سے وہ ہو آئی تھی۔ سعید کے گھر تو ہر لمحہ جھانک آتی تھی' سب دنیا کی نظریں بچا کر' کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ سعید کی عزت پر دھبہ پڑ جائے گا، وہ ہانپتی کانپتی لوٹ آتی........... پھر بھی وہ یہ حرکت کتنی بار کر چکی تھی' شاید دل کی دھڑکنوں سے زیادہ۔ ایک دو بار تو احتیاط بھی بھول گئی۔ سعید کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ جھانکتے جھانکتے خیال آیا۔ روز تو جاتی ہوں۔ پھر شرم کاہے کی........... کسی کام کا بہانہ سہی...........

ارے یہ تو اکیلا ہے۔ ماں شاید پڑوس میں کسی کام سے گئی ہے تو کیا ہوا' پہلے بھی تو کئی بار اکیلا ملا ہے۔ کھا تھوڑا ہی گیا بیچارہ .... میں کام کر کے چلی آئی اور وہ کتاب پڑھنے میں محو رہا........... "راجی!"

وہ سہم گئی۔ اس نے گھڑا جمانا چھوڑ دیا۔ سعید ہی کی آواز ہے۔ کتنی لرزش ہے اس میں .... "راجی"اس نے راجی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کھینچنے کی کوشش کی لیکن سعید کی گرفت تو اتنی والہانہ تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں کو سختی اورکھردرے پن کا احساس بھی بھول گئی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس کا جسم موم کی طرح پگھل رہا تھا۔

اس کی کٹیا کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کی پالتو بلی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی اندر آئی' شاید بھوکی تھی۔ راجی کے قدموں میں لوٹنے لگی........... بلی کی میاؤں اور اس کے لمس سے اس کے تصور کی دنیا درہم برہم ہو گئی۔ اس کا ہاتھ سعید کے خیالی ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا........... مگر اسے بلی پر غصہ نہ آیا۔ وہ مسکرا پڑی........... ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ لے کر اس نے بلی کو سینے سے چمٹا لیا اور اس کے رنگ برنگے نرم نرم جسم کو سہلانے لگی۔

بلی پیٹ کی بات بھول گئی اور پیار کی تھپکی سے آنکھیں بند کر کے خُر خُر کرنے لگی۔ راجی پھر سے فضاؤں کے پیچ و خم میں کھو گئی۔

ادھر سعید کو زندگی کی قدروں کا شعور تھا۔ وہ معاشرے کی صحت مندی پر یقین رکھتا تھا لیکن ایک جذباتی ریلے سے اس کا جو دامن بھیگ گیا تھا' اس نے اس کو بڑی الجھن میں گرفتار کر دیا تھا۔ زندگی کی ساری ذمہ داریاں ایک طرف تھیں۔ تعلیم کی ساری روشنی ایک طرف تھی۔ مگر راجی کی سہمی ہوئی پیشکش دوسری طرف تھی۔

راجی کے لوٹنے میں جو آمد تھی' وہ ان سب باتوں کی عظمت کو جھٹلا رہی تھی........... اگر یہ محبت ہے تو پھر اس کی شکتی پر یقین کیا جا سکتا ہے لیکن یہ محبت تو ہرگز نہیں تھی۔ یہ بات قطعی صاف اور یقینی تھی۔اس کو سعید سمجھ رہا تھا۔ راجی زندگی بھر کے لئے برداشت کی چیز نہیں ہے۔ وہ ایک احتیاج ہے بس...........! اور احتیاج بھی ایسی جس سے محض اپنی غرض مقصود ہو' دوسرے کو بھی اس سے سُود پہنچ جائے۔ یہ حادثے کی غیر ارادی اور اتفاقی صورت ہو گی۔

اُس نے محبت کی نہیں تھی لیکن محبت کے آفاقی نظریئے کو سمجھتا تھا۔ وہاں مقصد سے زیادہ ایثار ہوتا ہے۔ کچھ پانے کے بجائے دینے میں ایک خوشی ہوتی ہے لیکن یہاں تو صورت بالکل مختلف تھی۔ وہ اتنے بڑے دھوکے کو سمجھ رہا تھا لیکن پھر بھی دھوکہ کھا رہا تھا اور دھوکہ دے رہا تھا۔

مگر راجی پگلی تو بہت کچھ سمجھنے کے باوجود یہ بات نہ سمجھی تھی' سمجھ ہی نہ سکتی تھی........... "مردِ اور عورت!" بس........... وہ تو اس سادہ حقیقت کو جانتی تھی........... محبت کا فلسفہ...........؟

یہ تو کوئی روگ ہو گا' اس کی بلا جانے........... بھوکا روٹی کا ٹکڑا مانگتا ہے۔ پیاسا پانی کا گھونٹ' بھوک اور پیاس مٹنے کے بعد ہی سوچنے کا احساس جاگتا ہے' بات بھی ٹھیک تھی۔ کوئی دوسروں کے متعلق تب سوچے۔ کوئی دنیا کے متعلق تب سوچے'

جب اپنے لئے کچھ نہ سوچے اور اپنے لئے تب نہیں سوچے گا' جب وہ بھوکا نہ ہو گا' پیاسا نہ ہو گا۔

گرسنگی اور تشنگی تو تاریکی کی بدلی ہوئی شکل ہوتی ہے۔ تاریکی میں کوئی ٹھوکر کھا جائے۔ اندھیرے میں کوئی لُوٹا جائے تو قصور کس کا ہو گا .... تاریکی کا تو ہرگز نہیں تھا! اس لئے کہ یہ تاریکی تو کسی خاص ماحول کی تخلیق کردہ ہے۔ ماحول کو کوئی سزا نہ دے۔ ماحول کی بیٹیوں کا گلا گھونٹنے سے تو کچھ نہ ہو گا۔

راجی کا کیا قصور تھا اس کے نزدیک یہی محبت تھی۔ یہی محبت کی معراج............ معراج پر پہنچنے کا ایک موقع ہاتھ آجائے اور وہ بھی انسان کھو دے............ کیوں؟ اتنا بیوقوف کوئی کیوں بنے............!

سعید کی ماں بولی............

"نہ جانے آج راجی کہاں مرگئی ہے۔ صبح سے پانی بھرنے نہیں آئی!"

سعید بھی صبح سے کہیں نہیں گیا تھا۔ لیٹے لیٹے کتاب پڑھ رہا تھا۔ راجی کا ذکر سن کر اس کی سہمی ہوئی شکل اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

اس کی ماں راجی کا پتہ کرنے چلی گئی۔

راجی پانی بھر کر آئی تو اپنا سب کچھ چرا رہی تھی۔ من کے سوا باقی تمام جسم............ من اس کا دھڑک رہا تھا۔ سعید اسے کن اکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ راجی نے بھی ایک اڑتی نگاہ سے سعید کو دیکھ لیا تھا' اور جب سعید کو اس انداز میں اپنی طرف متوجہ پایا تو اسے بے حد عجیب لگا۔ اسے گھر کی ساری چیزیں ہوا میں معلق دکھائی دے رہی تھیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے ساری دنیا کی نگاہیں اس کے جسم کو چھید رہی ہوں۔ وہ بے حد گھبرا گئی۔

اسے ہر چیز دو دو نظر آنے لگیں............ گھڑے ٹھیک سے جے تھے لیکن راجی کو ان میں گزوں فاصلہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے ٹھیک سے رکھنے چاہے تو وہ اتنے

زور سے ٹکرائے کہ دونوں ٹوٹ گئے۔ سارا پانی بہہ گیا۔ راجی کے پاؤں ٹخنوں تک بھیگ گئے۔

سعید کی ماں چلّائی۔

"اندھی ہو گئی ہے تُو۔ ٹھنڈے گھڑوں کا ستیاناس کر دیا!"

سعید مسکرا رہا تھا۔ اس کی نظریں راجی کے کانپتے ہوئے پیروں پر ٹکی ہوئی تھیں۔

راجی تو گویا دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ اس کا جسم سن ہو گیا تھا۔ شدت حساس سے وہ بے حس ہو گئی۔ ایک کیفیت گھبراہٹ کی تھی' دوسری ملامت کی۔ گھڑوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ کاش وہ انہیں جوڑ سکتی۔ کاش وہ دیکھتے دیکھتے جڑ جاتے۔

سعید کی ماں چیخی۔

"اری اب کھڑی کیا منہ دیکھ رہی ہے' جا دفع ہو جا!"

راجی چلی گئی............ وہ ہونٹ کاٹ رہی تھی اور زمین کو گھور رہی تھی اور رز رہی تھی۔ وہ سچ مچ اندھی ہو گئی تھی............ وہ گھر جا رہی تھی۔ وہ گھر سے زر بھی گئی لیکن اسے پتہ نہ چلا۔ وہ گاؤں کے دوسرے کنارے پہنچ گئی۔ راستہ ختم و چکا تھا۔ آگے کھیت تھے اور کانٹوں کی باڑ............!

وہ چونک پڑی۔

"اوہ گھر تو پیچھے رہ گیا............!" وہ واپس مڑی............

کٹیا کا دروازہ کھول کر وہ کھاٹ پر بیٹھ گئی۔ معًا اس کے حلق سے ایک "کھی" ا آواز نکلی۔ شاید وہ ہنس پڑی تھی لیکن یہ ایک عجیب سی ہنسی تھی۔ چہرے پر اس کا وئی تاثر نہ تھا۔ بس ہنسی کی ایک شکل تھی۔ جو ڈکار کی طرح پیٹ سے ابھری تھی۔

چھوٹی سی کوٹھڑی' مٹی کی دیواریں' جھکی ہوئی چھت۔ راجی کی سانسیں اوپر نیچے

ہو رہی تھیں لیکن کون کہہ سکتا تھا.......... کہ راجی یہاں بیٹھی ہے۔ جانے وہ کس آکاش پر تیر رہی تھی اور کس پاتال کی خبریں لا رہی تھی۔

"کھی۔ کھی۔ کھی" کھی میں اضافہ ہونے لگا اور پھر کسی آبشار کی طرح اس میں تسلسل آ گیا۔ وہ کھٹ کھٹ ہنس پڑی.......... یہ سب کیا ہے؟ میں کہاں چلی گئی؟ گاؤں کے اس سرے پر۔ میرا گھر تو یہی ہے۔ یہی میری کھاٹ ہے۔ یہی میرا اوڑھنا بچھونا۔ شاید دیوانی ہو گئی ہوں۔ وہ دوبارہ ہنس پڑی۔ وہ پھر نیلے ساگر میں کود گئی۔

گھڑے ٹوٹ گئے' ٹھنڈے گھڑے۔ وہ قریب ہی تو پڑے تھے۔ اتنے دور کب تھے۔ میں ہی اندھی ہو گئی تھی۔ بے چاری سعید کی ماں کو دکھ ہوا' ٹھنڈے گھڑوں کے ٹوٹنے کا۔ اب ایک سال بعد ہی نئے اور کورے گھڑوں پر سبز کائی جمے گی اور..........

سعید ہنس رہا تھا۔ کائی کے غم سے بے نیاز.......... پانی بہہ جانے کا مزہ فوری اور لمحاتی سہی لیکن زندگی کی لپک تو تھی اس میں۔

شام ہوئی۔ اس نے مٹی کا دیا جلایا۔ روٹی صبح بھی نہیں کھائی تھی، شام کی بھی بھول گئی۔ فاقے اس نے بہت دیکھے تھے' پر یہ فاقہ نہ تھا۔ فاقہ مستی تھی' ایسی جو جبری نہ ہو' فطری ہو.......... بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ بڑی خوشی چھوٹی خوشی کو..........!

دیئے کی مخروطی لو لرز رہی تھی۔ سرمئی دھوئیں کی ایک لرزتی لکیر چھت کی طرف اٹھ رہی تھی۔ مٹی سے لپی ہوئی دیوار پر کالک کی ایک لکیر کھنچ گئی تھی۔ دھواں نامحسوس طریقے پر کمرے میں پھیل کر دروازے کی درازوں سے آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔ دیئے میں کڑوا تیل جل رہا تھا اور اس سے ایک خاص قسم کی بو نکل رہی تھی۔ راجی نے اس پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ آج وہ یہ بو بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔

دیئے کا عکس سامنے کی دیوار پر پڑ رہا تھا۔ راجی غیر ارادی طور پر اس کانپتے ہوئے سائے کو دیکھ رہی تھی۔ سامنے طاق میں ایک جست کا گلاس اور کچھ مٹی کے برتن پڑے تھے' جن پر ہلکی ہلکی گرد کی تہہ جم گئی تھی۔ پچھلی دیوار پر لکڑی کی کھونٹی پر راجی کے میلے کپڑے لٹک رہے تھے جو اس نے آج صبح اتارے تھے اور پھر دھوئے نہ تھے۔ فرش مٹی کا تھا' جس کی سطح ہموار نہ تھی۔ کہیں سے ابھری کہیں سے دبی ہوئی۔ راجی نے اس پر کبھی توجہ نہ دی تھی۔

ایک کونے میں جلنے والی لکڑیاں اور اُپلے بے ترتیبی سے پڑے تھے.......... چھت دھوئیں سے بالکل سیاہ ہو گئی تھی۔ دیواروں پر جمے ہوئے گرد کے چھوٹے چھوٹے ذرّے بھورے رنگ کے نقطے بن گئے تھے۔ راجی جان بوجھ کر ان سب چیزوں کو نظر انداز کرتی رہی تھی لیکن آج راجی نے کانپتے لرزتے سائے کو دیکھتے دیکھتے یہ فیصلہ کر لیا..........

کل سے یہ نہیں ہو گا۔ سب کمرہ جھاڑوں گی۔ ہر چیز باہر نکال کر صاف کروں گی اور پھر ترتیب سے انہیں جماؤں گی.......... دیواروں اور فرش تک کو بھی لیپ دوں گی۔ اس میں مشکل ہی کیا ہے۔ گوبر اور مٹی ملا ملا کر اس نے گاؤں کے کتنے گھر لیپ دیئے تھے۔

..........اس گندی کال کوٹھڑی میں کوئی آ جائے تو کیا سمجھے؟

اور پھر راجی نے وہ سب کچھ کر دکھایا جو سوچا تھا.......... راجی اب بے حد خوش تھی' بے حد مطمئن۔ زندگی کی ساری گھٹن ختم ہو گئی تھی.......... اب اس کوٹھڑی میں ایک سادگی' ایک ترتیب' ایک نفاست تھی۔ اس کے جسم پر کپڑے بھی اب میلے نہ ہوتے۔ اس کے پیروں اور ہاتھوں میں غیر قدرتی کھردرے پن کی بجائے اب فطری ملائمت آ گئی تھی۔ اس کی روح کی طرح سارا ماحول زندگی سے رچ بس گیا تھا۔

لیکن.......... سعید کی سنجیدگی میں ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ اور تردّد شامل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس نئی صورتِ حال سے بے حد سہا ہوا تھا۔ وہ بے طرح کُڑھتا' سوچتا' تلملاتا کوئی حل' کوئی تجویز اس جھنجھلاہٹ اور پریشانی کا مداوا بن سکتی ہے..........؟ کوئی بچاؤ' کوئی صورت احساسات کی اس تلخی کو دور کر سکتی ہے..........؟

وہ جتنا سوچتا' اتنا زیادہ پریشان ہوتا۔

لیکن.......... راجی؟.......... راجی کو کوئی غم نہ تھا۔ وہ اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر فخر کرتی تھی۔ میں ماں بنوں گی.......... ماں!.......... ماں!! کوئی مجھے بھی ماں کہہ کر پکارے گا۔ اب میں بھی کسی پر اپنا ہونے کا دعویٰ کر سکوں گی۔ میں ایک ننھے منے بچے کو جنم دوں گی۔ وہ بڑا ہو گا۔ جوان ہو جائے گا' پھر بھی میں اس کی ماں کہلاؤں گی۔ وہ مجھے ماں ہی کہے گا۔ کتنی بڑی تسلی کا سہارا لئے ہوئی تھی راجی..........!

گاؤں کی عورتیں اس سے مذاق کرتیں۔ طنز کرتیں۔ گالیاں دیتیں۔

"کلموہی..........! کلنکار..........!! .... حرام کار!!!! حرام کا پیٹ۔ شرم نہیں آتی۔"

کوئی مذاق کرتی۔

"راجی کس سے..........؟ کون تھا وہ؟؟"

کوئی دلاسہ دے کر پوچھتا۔

"اری بتاؤ بھی' کب تک چھپائے رکھو گی۔ شادی کرا دیں گے تمہاری اس سے!"

لیکن راجی کے پاس صرف ایک ہی جواب تھا۔ گالی' مذاق' طنز' کچھ بھی ہو۔ بس.......... وہ ہنس دیتی اور ہنسی بھی ایسی' جس میں ڈر' شرم اور غصے کے بجائے

فخر' عزم اور فتح کی چمک ہوتی.......... دوسرے لوگ جھنجھلا کر چڑ جائیں تو چڑ جائیں' اس کی بلا سے.......... وہ اپنی سانسوں کا نچوڑ' اپنی تمناؤں کا ثمر ضرور دیکھے گی۔

سعید کو سوچتے سوچتے صرف ایک ہی پناہ مل سکی.......... راجی اسے بچا سکتی ہے!

اندھیاروں میں بوئے ہوئے بیج سورج کی کرن دیکھتے ہی پھوٹ پڑیں گے۔ وہ راجی کے قدموں میں گر پڑا۔

"راجی.......... میری عزت!"

راجی پہلے تو حیران رہ گئی مگر پھر یہ خاکساری اسے پسند آ گئی۔ وہ مسکرا پڑی۔

سعید چیخا۔

"راجی تم بیوقوف ہو۔ تم اسے مذاق سمجھتی ہو۔ میں نے تمہارے قدموں میں سر رکھا ہے۔ میں تم سے بھیک مانگتا ہوں راجی' اپنی عزت کی، اپنے وقار کی، اپنی زندگی کی۔ تم میرا کہا نہ مانو گی تو میں خودکشی کر کے مرجاؤں گا۔ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاؤں گا راجی۔!"

راجی نے سعید کا یہ رخ کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

سعید نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر دبایا۔

"راجی! تم یہ سب باتیں نہیں سمجھتیں۔ تمہاری حالت دیکھ کر لوگ کیا کیا باتیں کر رہے ہیں اور جب بچہ پیدا ہو گا تو کیا کیا باتیں نہ ہوں گی۔ تم ہنس کر ساری دنیا کو ٹال سکو گی؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ معاشرہ تم سے پوچھے گا۔ حکومت اس کے باپ کا پتہ چلائے گی۔ یہ راز' راز نہیں رہ سکتا اور جب یہ راز' راز نہیں رہے گا تو میں گلے میں پھندا لگا کر مرجاؤں گا یا زہر کھا کر سو جاؤنگا۔ صرف تم ہی مجھے بچا سکتی ہو

راجی............ صرف تم!"

راجی جھنجلا اٹھی۔

"تو پھر میں کیا کروں............؟"

"راجی............!" سعید ایک نئے انداز میں اس کا نام لے کر خاموش ہو گیا۔ جو کچھ اس نے سوچا تھا، وہ سوچنا سہل تھا لیکن اس کا کہنا بہت مشکل۔ جو بات اپنے لئے گوارا نہ ہو' اسے دوسرے کے سر تھوپنا کتنا بڑا المیہ ہوتا ہے۔

"راجی۔ بس تم مجھے بچا سکتی ہو۔ اس کے لئے تمہیں کیا کرنا ہو گا' یہ تم خود سوچ لو۔ تمہارا فیصلہ میری زندگی اور موت کا فیصلہ ہو گا!"

راجی رو پڑی............ مگر اس کا رونا عام رونے سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک رہے تھے۔

"راجی............!" سعید نے اس کے گیلے رخساروں پر ہونٹ رکھ دیئے............ "میں تم سے شادی بھی کر لیتا۔ میں جانتا ہوں' تم بیوی بن کر نوکرانی کی حیثیت کو بھی معراج سمجھتیں۔ میں سمجھتا ہوں' دوسری شادی کرنے پر بھی تم کبھی میرے لئے باعثِ کوفت نہ بنتیں لیکن راجی............ یہ میرے ناموس کا سوال ہے۔ یہ میرے خاندانی لاج کا سوال ہے۔ جنسی احتیاج کی خاطر تمہارا انتخاب کر کے میں نے کتنی ذلیل حرکت کی ہے۔ جب لوگ یہ جان جائیں گے تو میری ساری تعلیم پر پانی پھر جائے گا۔ میرا سارا وقار مٹی میں مل جائے گا۔ میرے مستقبل کی ساری چمک دمک اس داغ کے سامنے ماند پڑ جائے گی۔ میں یہ برداشت نہ کر سکوں گا راجی کہ میرے ماضی کا ایک نقطہ میرے دامن پر ساری دنیا دیکھتی رہے............ راجی میرے ماتھے پر لگا ہوا کلنک کا ٹیکہ تمہارے آنسوؤں سے مٹ جائے گا۔ تم اسے دھو سکتی ہو، تم اسے مٹا سکتی ہو راجی............!!!

راجی رو رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں میں ایک اقرار لرز رہا تھا۔ اس کے رونے میں ہچکیاں نہ تھیں' سسکیاں نہ تھیں لیکن اس سکوت میں ایسی دلدوز چیخ کی بجلیاں کوند رہی تھیں' جس میں ایک عزم تھا' ایک روشنی تھی اور جس میں مظلومیت کی شکتی تھی۔

سعید اس کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ راجی کے ہاتھ چھوڑ کر وہ اٹھا، دروازہ کھلا تھا۔ باہر نکلنے لگا تو اس کا سر اوپر کی چوکھٹ سے ٹکرایا............ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ سر جھکا کر اندر آتا اور سر جھکا کر باہر نکلتا لیکن آج دروازے کی اونچائی وہ بھول گیا تھا۔

اس کی پیشانی سے خون نکلا۔ گھر پہنچ کر اس نے زخم دھویا اور پھر اس پر پٹی باندھ دی۔ شاید کلنک کا ٹیکہ بھی خون کے سرخ ذرّوں نے دھو لیا تھا۔

.... آج سعید شہر سے مقابلہ کے امتحان سے واپس آ رہا تھا۔ اپنی کامیابی کی اطلاع وہ تار سے دے چکا تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے اسٹیشن پر آج سارا گاؤں اس کے استقبال کے لئے جمع ہوا تھا۔ اس کا انتخاب سب جج کی حیثیت سے ہو گیا تھا۔ یہ اس گاؤں کی تاریخ کا سنہرا باب تھا۔

پھولوں سے لدا ہُوا سعید' گاؤں کے چھوٹے سے جلوس کے آگے آگے جا رہا تھا۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ کر گاؤں کے سجیلے فرزند کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

ان کے گاؤں کا ایک نوجوان مجسٹریٹ بنا تھا اور یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں تھی۔ اب وہ انصاف کی کرسی پر بیٹھے گا۔ لوگوں کو سزائیں سنائے گا۔ دنیا کے مقدمات کے فیصلے کرے گا۔ اچانک گاؤں کے ایک گوشے سے شور بلند ہوا!

عورتیں گلہریوں کی طرح چھتوں سے اتر گئیں۔ گاؤں میں شاید کوئی اور حادثہ ہو گیا تھا۔ سعید کا جلوس بھی گاؤں میں داخل ہو چکا تھا............ سارا جلوس ہنگامے کی طرف بڑھا۔ کسی ایک کو حادثے کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہزار

زبانیں، ہزار باتیں۔

"راجی نے پھانسی لگا لی............! راجی پھندا ڈال کر مر گئی............ راجی کی لاش چھت سے لٹک رہی ہے............ راجی نے بچہ بھی جنا ہے............ راجی کا بچہ زندہ ہے............ راجی مر گئی ہے!!"

تھوڑی دیر بعد سارا جلوس راجی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ راجی کی گردن میں واقعی پھندا پڑا تھا۔ راجی چھت سے لٹک رہی تھی۔ راجی کی آنکھیں کھلی تھیں اور زبان باہر لٹک رہی تھی۔

ایک سانولہ سلونا بچہ ٹھنڈے فرش پر پڑا بلبلا رہا تھا۔

راجی نے ایسا کیوں کیا............؟ وہ تو ہمیشہ ہنستی رہی۔ اپنے بچے کی ماں بننے کی اسے کتنی تمنا تھی۔ پھر اس نے خودکشی کیوں کی............؟ سارا گاؤں نئے مجسٹریٹ سے انصاف طلب کر رہا تھا۔ سب کی نگاہیں اس کے فیصلے کی منتظر تھیں؟

"بھائیو!............" سعید نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے گاؤں والوں کے دل موہ لئے............ "اس مظلوم عورت کی تجہیز و تکفین پوری عزت سے کی جائے۔ سارا خرچ میرے ذمہ............ اور یہ راجی کا بچہ............" اس نے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا............ "یہ آج سے میرا بچہ ہو گا!!" گاؤں والے حیران رہ گئے۔

"فرشتہ ہے فرشتہ۔ خدا جسے عروج دیتا ہے' دیکھ کر ہی دیتا ہے!"

۵۵

بلندی اور پستی

"زندگی کی سب سے بڑی خواہش؟"

"تکمیل محبت!"

"جھوٹ!"

"آزما کر دیکھ لو"۔

"دیکھا جائے گا............!"

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے اپنی تمام چیزیں بکھری ہوئی دیکھیں۔ سے غصہ آ گیا۔

"زینو............" وہ چلایا۔

"کیا ہے بھیا؟" ....

اور اس نے تڑاخ سے اسے چپت رسید کر دی۔

"کئی بار منع کیا ہے' میرے کمرے میں نہ آیا کرو۔ یہ کیا حال بنا رکھا ہے

کمرے کا"۔

وہ ہنس پڑی .... "چور کو سزا دو تو جانوں۔ مجھ غریب ہی کو تاکا ہے۔ بس جھٹ سے تھپڑ لگا دیا"

"چور .... کیسا چور ....؟"

"وہی جو پڑھنے کے لئے ناول لے جاتی ہے، رسالے لے جاتی ہے اور تمہارے افسانوں پر ریمارکس پاس کر کے واپس بھیجتی ہے"۔

"تو کیا چاند ....؟"

"جی ہاں!" زینو نے اس کی بات کاٹ لی۔ "حضور تو نام بھی جانتے ہیں ماشا اللہ"۔۔

"اچھا ...." وہ مسکرایا" شریر کہیں کی!"

زینو اس کی بہن تھی، چھوٹی بہن لیکن اتنی چھوٹی بھی نہیں، بس سال ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ ساتھ ساتھ پڑھتے رہے، ساتھ پٹتے رہے، رقیب بھی تھے، دوست اور ہم راز بھی۔ ایک دوسرے کو خوب سمجھتے تھے۔

چاند میونسپلٹی کے نئے سکریٹری کی لڑکی تھی۔ زینو کی سہیلی۔ ان کے گھر کے پاس ہی انہیں مکان ملا تھا۔ بڑی جھجک کے بعد ان کی دوستی بنی تھی۔ مہینے بھر تک ہر ایک غیر محسوس طور پر اپنی بڑائی جتاتی رہی۔ پہل یہ کرے پہل وہ کرے اور جب ان کی ماؤں کی ملاقات نے انہیں بھی ایک دوسرے سے ملا دیا تو دونوں کو محسوس ہوا، کتنی اچھی لڑکی ہے۔ غرور تو نام تک کو نہیں اور پھر دونوں کا زیادہ وقت ایک ساتھ کٹنے لگا۔

چاند زینو کے ہاں سے ناول لے جاتی، رسالے لے جاتی۔ زینو اسے فخر سے بتاتی۔ "یہ میرے بھیا کے افسانے ہیں، بہت اچھا لکھتے ہیں۔ بس ہر وقت لکھتے ہی رہتے ہیں

"مجال ہے لکھتے وقت ان کے کمرے میں جوں تک رینگنے کی جرأت کرے"۔

اور افسانے پڑھ کر عنوان کے پاس ہی ہری سیاہی سے اپنے عنوان جڑ دیتی۔

..... منٹو کے "بلاؤز" کی نقل .... عصمت کے "تل" کا خاکہ .... ندیم کی" شرافت" سے نا جائز فائدہ .... ممتاز شیریں کی "نگریا" میں چور .... ممتاز مفتی کی آپا کا اغوا۔

پھر روشنائی اور نکھرتی گئی۔ قلم بے باک ہوتا گیا .... "ڈوب مرو، شرم کرو" ...."کیا تمہیں ضمیر کچھ نہیں کہتا؟"............... جب ذہن میں وسعت نہیں تو لکھنا ہی چھوڑ دو۔

لیکن وہ نہ تو ڈوب سکا اور نہ ہی اسے شرم آئی۔ وہ لکھتا رہا۔ وہ ریمارک پاس کرتی رہی۔ وہ ہنستا رہا۔ مسکرا مسکرا کر ریمارکس پڑھتا رہا۔ اس نے کبھی چوری نہیں کی تھی۔ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس کا ہر افسانہ اس کے اپنے تخیل کی پیداوار تھا۔ وہ مطمئن تھا۔ چور ہی نہ تھا تو ڈر کاہے کا۔

جب زینب نے اسے بتایا کہ اس کے کمرے کی چیزیں کسی اور چور نے الٹ پلٹ کی ہیں تو اسے خوشی محسوس ہوئی۔ اُس نے میرے ذہن کو کریدنے کی کوشش کی اور آج یہ ہاتھ میرے کمرے تک پہنچ گیا۔ وہ ایک ایک چیز کو ٹٹولنے لگا۔

خط لکھنے کا پیڈ کھلا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں ایک سولیہ نشان پر جم کر رہ گئیں۔ وہی ہری روشنائی! لیکن صرف سوالیہ نشان ....؟" کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

اس نے پیڈ اٹھایا، دیکھا۔ آڑی ترچھی نظریں ڈالنے سے ایسا معلوم ہوا کہ چابی کی نوک سے یا کسی اور نوکیلی دھات سے کاغذ پر زور دے کر کچھ لکھا گیا ہے۔ اس نے پڑھنے کی کوشش کی۔ لکھا تھا۔

"زندگی کی سب سے بڑی خواہش ...."

آگے روشنائی کا سوالیہ نشان تھا .... "؟"

اس نے مسکرا کر نیچے لکھ دیا۔

"تکمیل محبت"۔

دوسرے روز اس کے نیچے لکھا تھا۔

"جھوٹ"۔

اس نے پھر لکھ دیا۔

"آزما کے دیکھ لو"۔

جواب ملا۔

"دیکھا جائے گا"۔

اس نے تکمیل محبت اور تکمیل وفا کے موضوع پر بہت سے افسانے لکھے، شائع ہوئے۔ چاند نے پڑھے۔ "ہیرو کا ایثار" .... "ہیروئن کی قربانی" .... "محبت کی پینگیں" .... لیکن وہ ہر عنوان کے ساتھ لکھتی رہی۔

"جھوٹ! بالکل جھوٹ!! سب جھوٹ!!!"۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ سبز روشنائی کے نیچے سرخ حروف مسکرانے لگے۔ ہری ٹہنی میں سرخ پھول ہی کھلتے ہیں۔

"پیار ....؟"

"ایک سچائی ہے"۔

"جھوٹ"۔

"سچ"۔

"کیونکر مانوں؟"

"چاند تاروں سے پوچھو۔ گل و بلبل سے پوچھو۔ شمع اور پروانے سے پوچھو"۔

"کوئی نئی بات کہو"۔

"اپنے سینے میں جھانکو"۔

"وہاں تو دل دھڑکتا ہے"۔

"اور یہ دھڑکن ....!"

"دوران خون کا ذریعہ، جسے موت کے بعد فنا ہے .... لیکن سچائی تو"۔

"جی ہاں۔ سچائی کو موت نہیں"۔

"پھر ---- ؟"

"انتظار کرو۔ سچائی دیکھ کر تمہاری آنکھیں خود بخود چندھیا جائیں گی"۔

"دیکھا جائے گا"۔

بھائی بہن سے راز چھپاتا رہا۔ بہن بھائی کی محبت میں امرت رس ملاتی رہی۔ زینو چاند کے ریمارکس میں برابر کی شریک ہوتی۔ دونوں مل کر نئے فقرے ایجاد کرتیں۔ دونوں جدت پسند تھیں۔ چاند مذاق مذاق میں ایک لذت آگئیں کیفیت سے دامن بھر رہی تھی اور زینو ہنسی مذاق میں بھائی کی تکمیل محبت کا سامان پیدا کر رہی تھی۔ دونوں کو مذاق کی نزاکت کا احساس تھا۔ وہ پیڑ پر سرخ اور ہری روشنائی کے مختصر سوال و جواب پڑھ کر لوٹ پوٹ ہو جاتیں لیکن اس اختصار کی جامعیت کا دونوں کو احساس تھا۔!

ہنستے ہنستے جب ان کی آنکھوں کے گوشے سمٹ جاتے اور مسرت کی لہر پھیلتے پھیلتے غائب ہو جاتی تو لاشعوری طور پر ان کے ذہنوں میں ایک سوال ابھرتا۔ ہم ایک دوسرے کو دھوکا تو نہیں دے رہے ہیں۔! .... کیا یہ سب مذاق ہے؟

زینو سوچتی، چاند دام میں آ گئی ہے۔ یہ دام میں نے بچھایا تھا۔ بھائی کی تکمیل محبت کی خاطر .... چاند کے قہقہوں میں میرے بھائی کی محبت کی گونج ہے۔ اس کے انکار میں اس کی آنکھوں کے اسرار پوشیدہ ہیں۔ پہلے دن افسانے پر ریمارکس

پاس کرنے کے لئے میں نے ہی تو اکسایا تھا، بیچاری چاند کو .... اس کا دل خوشی کے جذبات سے بھر جاتا۔ اور چاند سوچتی، شریر اور بھولی زینب! تم ابھی تک اسے کھیل ہی سمجھتی ہو، سمجھتی رہو۔ اگر تم بھی ان گہرائیوں کو پا گئیں، جن میں میں ڈوب چکی ہوں تو میں تمہاری نظروں کی تاب کب لا سکوں گی، کھیل میں سنجیدگی مجھے قطعی پسند نہیں۔ کھیل ہی کس بات کا جس میں ہنسی مذاق اور مسرت نہ ہو۔ چاہے ہار جیت میں زندگی کی بازی ہی کیوں نہ لگی ہو .... ! شاد اپنے کمرے میں گیا تو پیڈ غائب تھا۔ اس نے بہتیرا ڈھونڈا لیکن پیڈ نہ ملا۔ مکالمہ نکتہء عروج پر تھا۔ وہ زینو کو کان سے پکڑ کر کمرے میں لے آیا۔

"بتاؤ پیڈ کہاں ہے؟"

وہ چلانے لگی۔ "میں کیا جانوں۔بس میرے ہی کان کھینچنے کے لئے بہادر ہو"۔

"اور کس کے کھینچوں زینو!" وہ نرم پڑ گیا۔ منت کرنے لگا۔ "بتا دو نا زینو۔ میری اچھی زینو"۔

وہ مسکرا پڑی۔ "ہو گا یہیں کہیں میں کیا جانوں ...." وہ ڈھونڈنے لگی اور رضائی کی تہہ میں سے پیڈ نکل آیا۔

دونوں ہنس پڑے۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک انجانی حیا کی لہر دوڑ گئی .... زینب کی پلکیں غیر شعوری طور پر گر گئیں۔

"شریر!" شاد مسکرا پڑا ...."جاؤ چلی جاؤ"۔

اس نے پیڈ کھولا۔

"تو تم ادیب ہو؟"

"جی ہاں !"

"تب تم الو ہو!"

"کیوں؟"

"راتوں کو جاگتے ہو ناں"۔

"بات تو ٹھیک ہے"۔

"پھر ؟"

"لیکن وہ تو جانور ہے"۔

"تم بھی جانور ہو"۔

"ہوںٔ تو؟"

"مجھے جانور اچھے لگتے ہیں"۔

"سچ؟"

"جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے"۔

اس نے ایک طویل آہ کھینچی۔ پیڈ کو سینے پر رکھ کر شفاف چھت کو گھورنے لگا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ کس انوکھی ادا سے وہ دل میں آ گئی تھی .... خانۂ دل کی ویرانیوں میں گیت تھرکنے لگے۔ پھر افسانوں کی وسعتیں لا محدود ہوتی گئیں۔ خیالات کے دھارے سمندر کی سرکش لہروں کی طرح بڑھ بڑھ کر کناروں کو چھونے لگے .... "دل کی دنیا بھی کتنی حسین ہوتی ہے - !"

دوسرے روز وہ دفتر سے لوٹا تو زینو نے دبی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ وہ زینو کی نفسیات سے واقف تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا .... "زینو امی کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"چاند کی امی نے بلایا ہے انہیں"۔ زینو مسکرا رہی تھی۔

"تو تم اکیلی ہو؟"

"نہیں ...." اس نے سر ہلایا۔وہ بدستور ہنس رہی تھی۔

"کون ہے ....؟" اس کی آواز تھرا گئی۔

زینو کو رحم آ گیا .... "جائیے اپنے کمرے میں دیکھ آئیں"۔

اس نے ایک سہمی ہوئی نگاہ زینو پر ڈالی اور کچھ سوچتا ہوا اپنے کمرے کی دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ چاند ڈریسنگ ٹیبل پر جھکی ہوئی پیڈ پر کچھ لکھ رہی تھی۔ اس نے بڑھ کر دھیرے سے اپنے ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیئے۔ مردانہ ہاتھوں کے لمس نے اسے چونکا دیا .... "اوئی!" اور اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ شاد نے مسکراتے ہوئے پیڈ اٹھا لیا۔ ہاتھ چہرے سے ہٹا کر وہ پیڈ پر جھپٹی۔

"چھوڑ دو پیڈ"۔

"یہ میرا ہے"۔

"چھوڑ دو۔ نہیں تو میں رو پڑوں گی"۔ اس نے ہنس کر پیڈ چھوڑ دیا۔

"چاند رو پڑے تو ساری کائنات رو پڑے۔ اس کی تقدیر میں تو صرف ہنسنا ہی لکھا ہے"۔

چاند نے جلدی سے لکھے ہوئے فقرے مٹا دیئے۔

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ دل کے نقش بھی کبھی مٹنے پائے ہیں .... چاند نکلتا ہے تو کسی سے چھپا نہیں رہتا، سب دنیا اسے دیکھ پاتی ہے"۔

"ہٹیئے راہ سے مجھے جانے دیجئے"۔

"راہ .... ! کونسی راہ ....!! منزل پر پہنچ کر بھی کوئی راہیں ڈھونڈا کرتا ہے۔ !!!"

"شریف لڑکیوں سے باتیں کرنے کی تمیز سیکھیئے"۔

"تمیز .... ! واہ خوب کہی"۔ وہ ہنس پڑا۔ "جانوروں کو جیسی بولی سکھائی جاتی ہے، ان سے ویسی ہی توقع رکھنی چاہیئے"۔

وہ مسکرا دی۔

"چاند .... ! تم سچ مچ چاند ہو۔ زمین کا چاند' میرے دل کی چاندنی'

میرے افسانوں کی خیالی ہیروئن کا جو میرے ذہن میں رنگ و روپ تھا، وہ تمہارے ہی جسم میں ڈھل ڈھلا کر سما گیا ہے۔ تم نے پوچھا تھا۔ "زندگی کی سب سے بڑی خواہش؟" میں نے کہا تھا۔ "تکمیل محبت"! .... تم نے پوچھا۔ "پیار؟" میں نے کہا۔ "ایک سچائی ہے!" .... لو دیکھو میری آنکھوں میں جھانکو' پیار کی سچائی کیا ہوتی ہے۔ دلوں کے تصادم سے کیسا شعلہ پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کو زندگی کا ادراک کیسے ہو جاتا ہے ....!"

"ہاں تم بیٹھ جاؤ"۔ شاد نے چاند کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ چاند نے سحر زدہ سانپ کی طرح سر جھکا دیا اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔

"چاند! کمرے کی ان بے زبان چیزوں پر نظر ڈالو اور ان سے پوچھو تکمیل وفا کیا ہوتی ہے؟ تکمیل محبت کیا شے ہے؟ زندگی کی سب سے بڑی خوش بختی کیا ہے؟ سامنے آئینے میں دیکھو، تم کتنی شرمائی اور لجائی ہوئی ہو۔ یہ من کی جیت ہے لیکن تم پھر بھی میرے سامنے بیٹھی ہو۔ تمہارے پر کٹ گئے ہیں .... یہ پیار کی جیت ہے ....؟"

چاند چونک پڑی، وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جانے لگی۔

"تم جا سکتی ہو"۔ وہ ہنس رہا تھا ۔

"لیکن جھوٹے وقار کے لئے پیار کی سچائی کو نہ کچلو، کچل ہی نہ سکو گی ....! پھول سے خوشبو کہیں چھینی جا سکتی ہے !! .... سورج تپش نہ دے۔ چاند کی کرنوں میں خنکی نہ رہے، یہ کیسے ممکن ہے .... دانہ لاکھوں من مٹی کے نیچے دب جائے اور برسوں دبا رہے۔ جب موقع پائے گا، اس کا سینہ پھٹ پڑے گا اور ایک تناور درخت بن جائے گا ۔

چاند بارش کے قطرے سمندر سے اٹھتے ہیں اور سمندر ہی میں واپس آن گرتے ہیں۔ پیار کو محبت کی آغوش میں ہی پناہ ملتی ہے"۔ !

"شاد،" وہ چلائی۔ "بس کرو، بس کرو میں راہ بھول جاؤں گی"!

"تم نے راہ پالی ہے۔ چراغ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ راہی اور منزل، منزل اور راہی! .... بھول اور چوک یہ سماج کی باتیں ہیں۔ انہیں بھول جاؤ"۔

اسے یاد آیا۔ وہ دس گیارہ سال کی تھی۔ اس نے ایک سانپ دیکھا تھا۔ جو اپنے بل سے نکل کر پاس ہی دھرنا مار کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک مینڈک کودتا پھدکتا اس کے قریب آگیا۔ دونوں ٹھٹک گئے۔ دونوں شکار کی تلاش میں تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی زد سے باہر۔ دونوں ایک دوسرے کو احترام سے دیکھ رہے تھے۔ سانپ کی شفاف آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ بے حس و حرکت آنکھیں جھپکائے بغیر پڑا تھا۔ مینڈک ہلکی ہلکی پھاند سے سانپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر ٹکٹکی باندھے دیکھتا پھر اور آگے بڑھ جاتا۔ فاصلہ بہت کم رہ گیا۔ مینڈک نے آخری بار چھلانگ لگائی اور دوسرے لمحے وہ سانپ کے زہریلے منہ میں نوالہ تھا! سانپ کی آنکھوں میں سحر تھا یا مینڈک اس کی آنکھوں کو اپنا شکار سمجھتا تھا۔ اس کا رک رک کر آگے چلنا خدشے کی علامت تھی۔

وہ سانپ کے جسم سے ناواقف نہ تھا لیکن سانپ کی آنکھیں اتنی خوب صورت اور چمکتی ہوئی تھیں کہ اس کے حواس اور اعصاب کی تمام قوتیں آنکھوں پر ہی مرکوز ہو جاتیں اور وہ سانپ کے جسم اور منہ کو بھول جاتا۔ اور جب تمام احساسات سمٹ کر ایک نکتہ بن جاتے تو وہ نکتہ چمکتی ہوئی خوب صورت آنکھ بن جاتا .... وہ اپنے شکار کی طرف جھپٹا اور خود شکار ہو گیا............!!

چاند چلی گئی۔ دوسرے کمرے میں زینو مسکرا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ آج اس کی شرارت آمیز مسکراہٹ کا جواب نہ دے سکی۔ آتے ہی وہ اپنی شرارت فخریہ کیوں نہ بیان کر سکی .... وہ سہمی ہوئی کیوں تھی۔ وہ لجائی ہوئی کیوں تھی؟ اس نے تو کچھ بھی نہ کیا تھا صرف شاد کی باتیں سنی تھیں جس سے اس کا

دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے دل کو مضبوط کیا، اس نے خود کو سہارا دیا .... وہ مسکرانے لگی۔ وہ ہنسنے لگی .... "زینو" .... وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ سہاروں نے دم توڑ دیا۔ اسے اپنی بیچارگی پر افسوس ہوا ....

"زینو ....!" وہ سنجیدہ ہو گئی ...."یہ کیسا مذاق تھا زینو!! میں تو گرداب میں چلی گئی ہوں!!!" وہ رو پڑی۔

زینو نے اسے سینے سے لگا لیا .... "تو کونسا برا ہے۔ مجھے تم جیسی بھابی ملے تو ساری عمر چاند سے مقابلہ کرتی پھروں"۔

"کہیں یہ تار ٹوٹ نہ جائیں زینو"!۔

"ایسا نہ کہو چاند۔ میرے بھیا بہت بڑے انسان ہیں۔ وہ ایک ایک سانس تم سے نبھائیں گے"۔

اس نے زینو کی آغوش میں سر چھپا لیا۔ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ زینو کی آغوش میں اس نے مادرانہ گرمی محسوس کی۔ چاند کو سکون محسوس ہو رہا تھا۔ مذاق کے پردے چاک ہو گئے۔ تمناؤں کا رنگ بدل گیا۔ ملاقاتوں کے ڈھنگ بدل گئے۔ چاندنی راتیں مسکرانے لگیں۔ باغوں کے گوشے مہکنے لگے اور ٹھنڈی ہوائیں سرگوشیاں کرنے لگیں، تنہائیاں آباد ہو گئیں۔ افکار شاداب ہو گئے۔ ہر طرف شادمانی اور مسرت تھی ....

اندھیری رات تھی۔ صرف تاروں بھری رات۔ سب دنیا محو خواب تھی۔ دو پریمی جاگتے میں سپنا دیکھ رہے تھے۔ سہ پہر رات گذر گئی۔ پیار کی آنکھ ابھی کھلی تھی۔ قربت کی آرزو ابھی پیاسی تھی۔ باتوں کی لڑیاں ابھی ادھوری تھیں۔ شاد نے کچھ محسوس کیا۔

"چاند"۔

"جی............"

"رات بیت رہی ہے"۔

"ہوں"۔۔۔۔۔۔

"پھر؟"

"ابھی تارے جاگ رہے ہیں"۔

"تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"کس کا؟"

"جاگتے تاروں کا"۔

"یہ معصوم ہیں"۔

"اور یہ دنیا"۔

"معصوم تر"۔

"ارے..............!"

"کیوں؟"

"یہ دنیا اور معصوم؟"

"نہ سہی"۔۔۔

"پھر؟"

"محبت ساری کائنات پر غالب ہے!"

"یہ تم جانتی ہو؟"

"ہاں"۔

"کس نے بتایا؟"

"کبھی چڑیوں کے بے بال و پر بچے دیکھے ہیں؟"

"ہاں"

"انہیں آب و دانہ کے لئے منہ کھولنا کس نے سکھایا؟"

"اوہ .... چاند!"

"جی"۔۔۔

"تم دیوی ہو"۔

"صرف عورت"۔

"لیکن بہت اچھی"۔

"پہلے بھی تو تھی"۔

"مجھے معلوم نہ تھا۔"

"ہر عورت ایسی ہوتی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"فطرت کی تابع ! اور فطرت قدرت کا اٹل قانون!"

"اور یہ دنیا؟"

"اسے روند ڈالو!"

"ایسا ممکن ہے؟"

"ہاں"۔۔۔۔

"کیسے؟"

"فطرت کی موت ساری کائنات کی موت ہے ...."

"اس لئے ...."

"ہاں اس لئے ۔۔دنیا کی خاطر فطرت کی موت گوارہ نہیں کی جا سکتی!"

"میں سمجھ گیا"۔۔۔

"تو؟"

"تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں"۔

"کیسے؟"

"ایک معصوم سی جنبش کے ساتھ؟"

"کیوں؟"

"دل کہتا ہے"۔

"پر کیوں؟"

"تاکہ فطرت زندہ رہے"۔

"سمجھ گئی"۔

"کیا؟"

"بس یہی کہ ....!" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

معصوم سی جنبش کے لئے حرکت پیدا ہوئی۔ چند مقدس اور پر عظمت لمحے پیدا ہوئے۔ نسیم مہک اٹھی۔ رات بیت گئی۔ صبح کے ستارے آخری بار مسکرا کر روپوش ہوگئے۔

دوسری شام باغ کے ایک گوشے میں وہ چاند کا انتظار کر رہا تھا۔ رات کی رانی نے فضا کو مہکاروں سے معطر کر رکھا تھا۔ وہ سبز گھاس کے ہرے قالین پر لیٹا رات کی رانی کی جوان امنگوں سے کھیل رہا تھا۔ کبھی پتی توڑتا، کبھی ننھی منھی کونپل .... غیرارادی طور پر اس نے کئی پتے توڑ لئے اور کئی کونپلیں ....!

اس کا کھیل رات کی رانی کی زندگی کا سودا تھا۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اس کے کانوں میں پارہ انڈیل گیا .... رانی کے پودوں کے جھنڈ کی دوسری طرف سرگوشی ہو رہی تھی۔ "زینو ....!"

"جی" ———

"جی" ———

"کیوں؟" وہ ہنس پڑی۔

"یہ تمہاری جی" ———

"کیا ہے، اس میں" ———

"رس امرت" ———

"اور کچھ" ———

"مٹھاس، چاشنی !!"

"اور" ———

"زندگی .... زندگی ہی زندگی !!"

"جھوٹے کہیں کے"۔

"جھوٹی کہیں کی"۔

"تم" ———

"تم"

"چلے جاؤ" ———

"چلی جاؤ ناں" ———

"ٹھہرو ....!" شاد بھوکے بھیڑیئے کی طرح جھپٹا۔ وہ دونوں گھتم ہو گئے۔ وہ حنیف کے سینے پر چڑھ بیٹھا .... گالیاں بکنے لگا .... "ذلیل پاجی!"

"تمہاری یہ جرأت جہنم رسید نہ کر دوں تو میرا نام شاد نہیں ...."

اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی ۔ حنیف نے اس سے جان چھڑانی چاہی .... شاد نے اسے زور کا دھکا دیا۔ وہ شیشم کے درخت سے جا ٹکرایا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ خون بہنے لگا۔ وہ گر پڑا۔

شاد مڑا .... اس نے اپنی بہن زینو کو چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا .... "کمینی کتیا .... !یہ ہے آزادی کا نتیجہ !! ....

"دیکھوں گا"۔

وہ گڑگڑانے لگی۔ "بھیا .... بھیا"۔۔۔

"خاموش! رذیل کُتّی .... بھیا کہتے ہوئے تجھے لاج نہیں آتی۔ بے حیا، بے شرم!" وہ بالکل حیوان بن گیا تھا۔ اس نے زینو کو مار مار کر ادھ مؤا کر دیا .... تین دن تک مارے غیرت کے گھر نہ آیا۔

چاند زینو کے پاس بیٹھی ہوئی اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو تک رہی تھیں۔ دونوں کی پلکوں پر آنسو تیر رہے تھے۔ آنسوؤں میں سسکتی ہوئی کہانیاں تھیں .... خاموش گفتگو تھی .... "یہ کیا ہوا .... یہ کیا ہوا؟ اتنا بڑا انسان اور اتنی چھوٹی حرکت۔ اتنی بڑی سچائی اور یہ فرار ......!"

انسان چاہتا کیا ہے اور کرتا کیا ہے .... افکار و کردار کا یہ تضاد' اپنی پسند کو فطرت کا شاہکار سمجھا جائے، دوسرے کی خواہش کو اپنے ننگ و ناموس کی گھڑی! زینو کے آوارہ آنسو رخساروں پر بہہ گئے۔ چاند کی پلکوں سے بھی قطرے ڈھلک کر زینو کے بالوں میں جذب ہو گئے۔

"چاند ...." زینو پکار اٹھی۔

"زینو ...."

"چاند" .... "زینو"!

دونوں خاموش ہو گئیں۔ دونوں نے جانے کس کو پکارا تھا۔ آواز خلاؤں میں کھو گئی .... چاند نے اس کے دونوں ہاتھ چوم لئے۔ وہ اس کے سر میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ شاد .... اعتدال پر آگیا تھا۔ تین دن کی مسافت کے بعد وہ گھر لوٹ آیا۔ اپنے کمرے میں وہ ایک ادھورے افسانے کو آخری ٹچ دے رہا تھا۔ افسانے کا خوشگوار اختتام اسے مصنوعی معلوم دیتا ہے۔ اس کے ہر افسانے کا اختتام دردناک ہوتا .... اس کے مزاج کا یہ پہلو بڑا فطری تھا۔

چاند، زینب کی تیمارداری کی غرض سے چند روز سے یہیں تھی۔ تپائی پر چائے ، کر بولی۔ "کیوں جی افسانہ مکمل نہیں ہوا؟"

"چاند جی ...." وہ مسکرایا .... "بس آخری ہچکیوں پہ ہے۔ اختتام پر پہنچ کر قاری کو رونا پڑے گا ......!"

"خوب بہت خوب! آج کیا دن ہے شاد صاحب؟"

"ہاں تم نے خوب یاد دلایا، سال بیت گیا۔ آج وہی دن ہے جس روز تم نے لکھا تھا"

"زندگی کی سب سے بڑی خواہش؟" اور میں نے لکھ دیا تھا۔ "تکمیل محبت ...." ہماری محبت کی سالگرہ! میں موہنی جیولری ہاؤس کو آرڈر دے آیا ہوں۔ محبت کا انمول تحفہ! نیلم کی انگوٹھی!"

"جی ہاں ایک سال بیت گیا۔ میں آج اس افسانے کا آپ کو اپنی پسند کا اختتام بھی دے رہی ہوں۔ اور پیار کا ایک انمول تحفہ بھی!"

"چاند ....!"

"جی گھبرائیے نہیں۔ معصوم محبت کا معصوم تحفہ پُر عظمت لمحات کی مقدس تخلیق!"

وہ اس کے قریب ہو گئی۔ شاد کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھے میں لے کر ایک عجیب انداز سے اسے گھورنے لگی۔ اس کا چہرہ جھکتا گیا .... جھکتا گیا .... فاصلہ بہت کم رہ گیا .... اور اس نے .... اس نے شاد کے چہرے پر تھوک دیا۔

ایک نفرت آمیز مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔

کیفیتیں

زندگی بھی ایک عجیب تانا بانا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا لمحہ ہو جس میں آپ خود کو خالی الذہن سمجھیں اور کسی کیفیت میں مبتلا نہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہ زندگی سراپا کیفیت ہے۔ سوتے جاگتے' چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے' کھاتے پیتے' روتے ہنستے' کھیلتے دوڑتے غرضیکہ زندگی کے ہر موڑ پر ہر قدم پر' ہر حال میں' ہر پسپائی میں' ہر جیت میں آپ کسی نہ کسی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ ہاں! یہ اور بات ہے کہ یہ کیفیتیں روزمرہ کا معمول بن کر ہمارے خون اور ذہن میں اس طرح رچ گئی ہیں کہ ہم محسوس نہیں کرپاتے۔ اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے ذہن پر زور دے کر سوچیں گے تو آپ کو فورا" یقین آ جائے گا۔ کہ آپ تو کیفیتوں کا ایک مجموعہ ہیں۔ چاہے آپ خود کو اشرف المخلوقات کہیں یا کچھ اور۔

اور اگر آپ کو کچھ شک ہے۔ تو سنیئے۔ آپ زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ آپ کی خواہش ہے۔ کہ دیر تک زندہ رہیں۔ دیر تک زندہ رہنے کے لئے اچھی صحت لازمی

ہوتی ہے۔ اور اچھی صحت کے لئے اچھی خوراک اور اچھی خوراک کے لئے پیسہ۔ پیسے کے لئے آپ اچھی ملازمت تلاش کرتے ہیں ۔ اچھی تجارت شروع کرتے ہیں ، محض اس لئے کہ آپ زندہ رہیں اور جب تک زندہ رہیں خوش رہیں ، مسرور رہیں۔ ان مرحلوں میں آپ پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جدوجہد کی کیفیت تگ و دو کی کیفیت' زندہ رہنے کی کیفیت' خوش رہنے کی کیفیت' عمل و رد عمل کی کیفیت!

لیکن جب اس کشمکش میں آپ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو آپ پر مسلمان ہونے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور یہ سطحی مسلمانی آپ کی تقدیر کی کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے اور تقدیر آپ کو صبر کی کیفیت میں جھونک دیتی ہے لیکن اگر آپ تنگ ظرف قسم کے انسان نہیں اور صبرِ ایوبیؑ آپ کی قسمت میں نہیں تو آپ اس ناکامی سے اینٹھن اور تشنج کی کیفیت میں جا پڑتے ہیں۔ یہ تشنج یا اضطراری کیفیت آپ کی عقل پر حملہ کرتی ہے اور آپ کو احمقوں کی دنیا میں لے جا کر حماقت کی کیفیت بخش دیتی ہے۔ ایسے حالات میں کچھ بھی نہیں سوجھتا اور یہ بڑی انتشار کی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ انتشاری کیفیت بڑی نفرت انگیز کیفیت ہوتی ہے۔ یہ حماقت' انتشار اور یہ نفرت آپ سے عزم و استقلال کی کیفیت چھین لیتی ہے۔ یوں آپ سے تحمل اور برداشت کی کیفیت بھی جاتی رہتی ہے۔ پھر تو آپ جرأت کی کیفیت بھی کھو دیتے ہیں۔ بلکہ قناعت و سنجیدگی کی کیفیت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور جب آپ یہ سب کیفیتیں کھو بیٹھتے ہیں تو ایک گستاخ قسم کی کیفیت سہارا دیتی ہے۔ لیکن تا کجے!

پھر تو آپ دروغ اور جھوٹ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں لیکن اس جھوٹی کیفیت کے تو سنا ہے پاؤں تک نہیں ہوتے۔ پھر تو آپ کو لازماً مایوس ہونا پڑتا ہے اور مایوسی کی کیفیت میں ہار کی جھلک نظر آ جاتی ہے اور ہار کی کیفیت زندگی کی سب سے ناکام کیفیت ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ آپ ہار سے بیزار نہ ہوں اور پھر سے خود کو ایک نئی تنظیمی کیفیت دے کر زندگی کا ایک نیا باب کھولیں۔

کبھی کبھی آپ پر شیریں سپنوں کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ یہ بڑی نرالی اور لطیف کیفیت ہوتی ہے۔ آپ گھوڑے پر سوار ہیں۔ اور آپ کا گھوڑا فضا میں اڑا جا رہا ہے۔ آپ بدلیوں اور ستاروں کی سیر کر رہے ہیں۔ یہ بڑی کیف زا کیفیت ہوتی ہے۔ یا یوں بھی ہوتا ہے ، آپ بغیر پروں کی مدد سے ہوا میں معلق ہیں ۔ ناچ رہے ہیں ۔ اڑ رہے ہیں۔ بھاگ رہے ہیں ، ہنس رہے ہیں۔ آپ بہت ہلکے ہلکے ہیں۔ اس وقت آپ کے مزے' سرور اور فردوسی کیفیت میں ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ چاند کو ہاتھ لگا آؤں۔ بلکہ اسے روز کا معمول سمجھتے ہیں کہ اچانک مؤذن "اللہ بہت بڑا ہے" "اللہ بہت بڑا ہے" کی نوائے دلفریب سے آپ کی آنکھ کھلتی ہے۔ آپ مسکرا کر کلمہ پڑھتے ہیں۔ اس مسرت انگیز کیفیت میں آپ اپنی خوش آئند مستقبل کی تعبیر دیکھتے ہیں۔ اٹھ کر وضو کرتے ہیں اور اپنے اللہ کے حضور میں عجز و نیاز اور احترام کی کیفیت میں کھو جاتے ہیں۔

کبھی آپ بڑے بڑے خوفناک خوابوں کی کیفیت میں ہوتے ہیں۔ سانپ ہیں جو چاروں طرف سے آپ کو گھیر چکے ہیں۔ کالے' چت کبرے' پیلے' سرخ انگاروں جیسے منہ والے' آپ کے لئے کوئی راہ فرار نہیں۔ یہ بڑی خوفناک اور دردناک کیفیت ہوتی ہے سخت کوفت کی کیفیت ہوتی ہے۔ یا خونی کتے ہیں جو آپ کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ان کے منہ سے شعلے نکل رہے ہیں، جھاگ ٹپک رہی ہے۔ آپ ہیں کہ بھاگے جا رہے ہیں لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر دو قدم آگے بڑھتے ہیں تو تین قدم پیچھے ہٹتے ہیں اور جیسے آپ کے پیر من من کے بھاری ہو گئے ہیں۔ یہ بڑی کرب و وحشت کی کیفیت ہوتی ہے ، جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ آپ کے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔ آپ جاگ پڑتے ہیں۔ خود کو چارپائی پر محفوظ پا کر آپ پر تشکر کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ بار بار کلمہ پڑھتے ہیں ، توبہ استغفار کی کیفیت' دو رکعت نماز نفل' سجدہ اور بندگی کی کیفیت' لیکن یہ پورا دن ایک گھٹن کی کیفیت آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ عفو و رحم کی کیفیت میں

سوا روپیہ کی شرینی پیر دستگیر کی روح سے فیض حاصل کرنے کے لئے بچوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ پھر بھی نحوست کی کیفیت آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتی کیونکہ آپ کے دل میں ابھی تک شر، اور فساد کی کیفیت ہے۔

ہاں ! اگر آپ جوان ہیں تو کیا کہنے۔ آپ کی کیفیت تو بس ایک کیف و وجدان کی کیفیت ہوتی ہے۔ پیار و محبت کی کیفیت کہ سوا سب دنیا پاپی۔ سب کائنات جھوٹی !! سچ بھی تو ہے انسان انسان کو پیار کرے۔ "بہت بڑی بات ہے" "زندگی اتنی مختصر ہے کہ حقیر نہیں ہو سکتی" بغض و حسد کی کیفیت کی گنجائش رکھی جائے تو یہ زندگی بار نہ بن جائے۔ "محبوب" ! کتنا پیارا لفظ ہے اور کتنی لطف انگیز کیفیت کا حامل اور اس کا انتظار ! اور یہ انتظاری کیفیت ' یہ بے تابی و بے قراری کی کیفیت' کتنی سکوں بخش کیفیت ہے۔ یہ لگن کی کیفیت کتنی رنگین کیفیت ہے۔ یہ فراق و جدائی کی کیفیت کتنی اذیت بخش کیفیت ہے لیکن یہ خلش و کسک کی کیفیت کتنی دلفریب اور روح پرور کیفیت ہوتی ہے۔ یہ آرزو و تمنا کی کیفیت ولولوں اور امنگوں کی کیفیت ' جستجو اور تلاش کی کیفیت کتنی پیاری کیفیتیں ہیں۔ شرم و حیاء کی کیفیت' مسکراہٹوں اور جھکی ہوئی پلکوں میں حجاب کی کیفیت اور اس میں معصوم سی کیفیت کی آمیزش' کتنی دلربا کیفیت ہوتی ہے۔ اور جور و جفا کی کیفیت' شوخ و شریر بوس و کنار کی کیفیت' وہ راز و نیاز اور اختلاط کی کیفیت کیا بھولنے والی کیفیتیں ہوتی ہیں؟

اور ہاں ! ان کی چمکتی آنکھوں میں ہمدردی کی کیفیت' مخمور اور چھلکتی نینوں میں سپردگی کی کیفیت' شکوہ و شکایت کی کیفیت دیکھی ہیں کبھی یہ کیفیتیں ؟ وہ باد بہاری ہیں چمن کے گوشوں کی رومان انگیز کیفیت وہ راگ و رنگ کی کیفیت' فدا اور شیدا اور فخر و ناز کی کیفیت' آنکھوں ہی آنکھوں میں پیام و پیغام کی کیفیت' کیا کبھی واسطہ نہیں پڑا ان کیفیتوں سے ؟" اور ہاں سنو ! وہ وفا کی کیفیت وہ راستی اور سچائی کی کیفیت' وہ تقدس اور پاکیزگی کی کیفیت اور وہ "منصور" کے "انا الحق" کی کیفیت؟ پتھر لگتے رہے تو ہنستے

اور مسکرانے کی کیفیت اور جب پھول لگا تو رونے کی کیفیت' کتنی انوکھی اور نرالی کیفیتیں ہیں دنیا میں !

ہاں ہاں !! یہ نہ سمجھئے کہ کیفیتیں ختم ہو گئی ہیں اگر آپ کاتب ہیں تو لکھنے کی کیفیت میں مبتلا' کہیں کیفیت کا شد رہ نہ جائے اور ف' غ نہ بن جائے اگر غ' ف بن گیا ک' گ بن گیا تو غلطی کی سزا، نوکری چھوٹنے کا غم ' اور غم کیا ہے۔ پریشانی کی ایک کیفیت. اگر آپ خدا نخواستہ ایڈیٹر ہیں تو شندرہ اور ایڈیٹوریل کی کیفیت میں پریشان، سنسنی خیز سرخیاں جمانے کی کیفیت میں سرگرداں اگر ایڈیٹوریل کے لئے کوئی اچھا مواد یا موضوع نہ ملے تو ایک عجیب سی الجھن اور یہ الجھن کی کیفیت' بس دل بیٹھا جائے. ایڈیٹوریل زور دار ہو تو ایک فخر و شوق کی لطیف سی کیفیت' کبھی کبھی عوام کے بے حس ہونے کے غم میں افسردگی کی کیفیت' ایک لاعلاج اور رنجیدہ کیفیت۔ اگر آپ شاعر اور ادیب ہیں تو لطیف اشاروں تشبیہوں اور اشعاروں کی کیفیت میں مستغرق ! افسانوں کے موضوع کی جستجو اور ایک کھوئی کھوئی کیفیت میں سرگرداں دل سماج اور معاشرت کا اصلاحی پہلو کے ایک لطیف' درد کی کیفیت سے معمور ! طمانیت' خود داری اور ذمہ داری کی ایک انوکھی کیفیت سے مستور !

اور اگر آپ دکاندار ہیں تو معاف کیجئے گا حرص و ہوس کی کیفیت سے پیٹ پھولا ہوا۔ اگر حاکم ہیں تو ایک حاکمانہ تکبر کی کیفیت اور شان بے نیازی میں سرشار اگر محکوم ہیں تو ضمیر اور اصول کی کشمکش اور ان مٹ جانے کے احساس کی کیفیت میں دلفگار ! اگر جابر ہیں تو ظلم کے نشے کی کیفیت میں مخمور، اور مظلوم ہیں تو بیچارگی کی کیفیت میں نظریں آسمان پر جمائے ہوئے' درماندہ' محبت میں۔ تو دنیا سے بیزاری کی کیفیت میں گریہ کناں ' رقیب ہیں تو حسد و رشک اور رقابت اور جلن کی کیفیت میں جگر دوز ! لہٰذا آپ حیران نہ ہوں، تعجب اور حیرانگی کی کیفیت بھی ہوتی ہے دنیا میں ! ابھی بہت سی کیفیتیں باقی ہیں لیکن کیا کروں گا میں خود سراپا کیفیت ہوں۔ پاجامہ پھٹ گیا ہے

اس کا رنج' پتلون پرانی ہو گئی ہے اس کی فکر' جوتے پرانے ہو گئے ہیں اور دوڑنے کو جی چاہتا ہے ' محبت پامال ہو رہی ہے اور آدمی زندہ رہے' یہ عجیب کیفیتیں ہیں۔ یہ کیفیتیں بالکل پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ آپ بھاگ جائیں ، سو جائیں ، مر بھی جائیں تو بھی مرنے کی کیفیت زندہ رہے گی۔ سائے کا ساتھ اتنا اٹل نہیں ، وہ رات کی سیاہی میں ساتھ چھوڑ دیتا ہے لیکن یہ کیفیتیں؟

یہ تو ہمارے شریانوں میں دوڑ رہی ہیں۔ یہ ہمارے سانس میں گھل مل گئی ہیں۔ یہ ہماری روح میں تحلیل ہو گئی ہیں۔ انہیں ساتھ رکھنا ہی ہو گا۔

"ہاں ! یہ آپ کے بس کی بات ہے۔ آپ ان کے زیر ہو جائیں یا انہیں زیر کر لیں"۔

❀❀

خاموش نگاہیں

دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔

دونوں کی خاموش نگاہوں میں ہزاروں سودے تھے۔ وہ آج پردیس جا رہا تھا۔ منزل کا کوئی پتہ نہ تھا' پر منزل ڈھونڈنے جا رہا تھا............ اونچے سیاہ' بے آب و گیاہ' جلے ہوئے پہاڑوں کے رہنے والے جب منزل کی تلاش میں نکلتے ہیں تو اٹک پار کر لیتے ہیں۔ اٹک پار کرنے کے بعد خلیج بنگال اور راس کماری بلکہ برما تک ان کی اصطلاح میں ہندوستان کہلاتا ہے۔ ہندوستان کی زمین سونا اگلتی ہے اور اس سے اپنا حصہ الگ کرنے کے لئے وہ اٹک پار کر لیتے ہیں۔

سونے ہی سے دنیا کے سب کام نکلتے ہیں۔ وہ سونے ہی کی تلاش میں اٹک پار کر رہا تھا۔

وہ آج منزل کو چھوڑ کر منزل ڈھونڈنے جا رہا تھا۔ مجبور تھا' منزل کو حاصل کرنے کے لئے منزل چھوڑنے کی ضرورت تھی!

وہ بچپن میں یتیم و ولیسیر رہ گیا تھا۔ ماموں نے اس کی پرورش کی تھی اور اب وہ ایک خوبصورت کڑیل جوان بن چکا تھا۔ اس کی امنگیں بھی جوان ہو چکی تھیں۔ اس نے مہرجان کے رشتے کے لئے ماموں کو کہلوایا۔ مہرجان اس کے ماموں کی لڑکی تھی۔ دونوں کا بچپن ساتھ ساتھ گزرا تھا۔ دونوں نے لڑکپن میں ہی میاں بیوی کے کھیل کھیلے تھے۔ وہ ناراض ہو جاتا تو مہرو مناتی۔ مہرو روٹھ جاتی تو یہ مناتا۔ دونوں یک جاں دو قالب تھے۔ لڑتے جھگڑتے کھیلتے دونوں جوان ہو گئے۔ کھیل اب بھی ختم نہیں ہوا تھا لیکن کھیل کی نوعیت بدل گئی تھی۔ کھیل پر ایک پروقار سنجیدگی چھا گئی تھی۔

نگاہیں الجھ جاتیں لمحہ بھر کے لئے لیکن یہ لمحہ برسوں کی کہانی کہہ جاتا۔

دونوں شرمسار ہو جاتے۔ نگاہیں الجھ جاتیں لمحہ بھر کے لئے لیکن یہ لمحہ برسوں کی کہانی کہہ جاتا۔ دونوں کا قریبی رشتہ اژدہے کی طرح منہ کھول لیتا۔

ہر ایک اپنے طور پر سنبھل جاتا اور یہ سنبھلنا ایسی تحریک کا منبع ہوتا جس سے بچپن کی یادوں کے بہت سے رو پہلی چشمے پھوٹ نکلتے۔ دونوں سوچتے یہ ہمیں کیا ہو جاتا ہے.............. ہم ایک گھر کے فرد ہیں۔ ہم ایک جگہ کام کرتے ہیں۔ ایک گھر میں سوتے ہیں لیکن اُس وقت ہمارے جسموں میں ایک آگ سی کیوں پھیل جاتی ہے' جب کام کرتے کرتے معاً" ہمارے جسم آپس میں چھو جاتے ہیں۔

وہ میرے ماموں کی لڑکی ہے.............. وہ میرے پھوپھی کا لڑکا ہے۔ ہمارے رشتے خونی رشتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو بہن بھائی کہہ کر پکارتے ہیں.............. پھ یہ دلوں کی پکار ان خونی رشتوں کا احترام کیوں نہیں کرتی؟ ہمارے ذہن بہن بھائی کی طرح صاف کیوں نہیں ہیں؟ ہمارے تصورات اتنے الجھے ہوئے کیوں ہیں..............

ہم ایک دوسرے کا دبا دبا احترام کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی بات کی تائید کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ یہ دبا دبا احترام کیا شے ہے؟ یہ بے موقع کی تائید کیوں کر ہو جاتی ہے؟

ماحول اور تربیت نے انہیں مجبوراً" ایک دوسرے سے دور دور رکھا لیکن دونوں جانتے تھے کہ ہماری سوچیں ایک سی ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے والہانہ محبت ہے۔

اور جب ولی خان نے ماموں سے رشتے کے لئے کہلوایا تو اس نے صاف صاف کہہ دیا۔

"ولی خان میری مرحوم بہن کی آخری نشانی ہے۔ یہ رشتہ ولی خان سے نہیں ہو گا تو اور کس سے ہو گا۔ یہ دونوں ابھی ماؤں کی گود ہی میں تھے کہ مرحوم بہن نے ہنستے ہنستے مہرو کی منگنی کر دی تھی لیکن میں چاہتا ہوں کہ ولی خان جو اب جوان ہو چکا ہے' اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو جائے۔ دو ہزار تو مجھے مہرو کے عوض لینے ہی پڑیں گے۔ اس سے کم لوں تو ناک کٹ جائے گی۔ تربوروں اور برادری میں کس کی لڑکی ہے جس کی قیمت دو ہزار سے کم پڑی ہو!"

اور جب ولی خان نے یہ سب کچھ سنا تو مسکرا پڑا۔

اچھا ہوا ماموں دو ہزار پر راضی ہو گیا۔ مہرو سونے سے تول لی جائے تو بھی مہنگی نہیں۔

اور آج وہ دو ہزار کے لئے دیس سے پردیس جا رہا تھا۔ صرف مہرو کی آنکھوں سے اوجھل ہو جانے کا صدمہ تھا' ورنہ یہ کوئی سعادت نہ تھی کہ وہ مہرو کو مستقل طور پر اپنانے کے لئے تگ و دو میں مصروف رہتا۔

مہرجان کو ان سب باتوں کا علم تھا اور اس لئے آج وہ اپنی فطری شرم و حیا اور عزت نفس کے باوجود اپنے منگیتر کو الوداعی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ولی خان کو اس کے جذبات اور ذہنی کشمکش کا علم تھا۔ تسلی کے لہجے میں بولا۔

"تم جانتی ہو نا مہرو' میں کیوں ہندوستان جا رہا ہوں؟"

مہرو خاموش تھی۔ اس کی پلکوں پہ آنسو تیر رہے تھے۔

"پگلی!" ولی خان نے اس کے آنسو پونچھے............ "تین چار برس کی تو ساری بات ہے۔ تم چاند گنتی رہو۔ جب بارہ چاند پورے ہو جائیں تو ایک سال ختم ہو جائے گا .... پھر دوسرا' تیسرا اور چوتھا سال۔ تم چشمے کے کنارے شہتوت کے درخت پر لکیریں کھینچتی رہو۔ آنکھ جھپکتے میں چار برس گزر جائیں گے۔ بس پھر ساری عمر کا ساتھ ہو گا۔ دو ہزار ہی تو ہیں شاید چار برس سے پہلے ہی کما لوں"۔

مہرو رو پڑی اور اپنے آستین سے آنسو پونچھنے لگی۔ ولی خان نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکالی۔ جس کے ڈھکنے پر منہ دیکھنے کا آئینہ لگا ہوا تھا۔ اس نے ڈبیہ کھولی اور مہروں کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"دیکھو' یہ تمہارے پیار کی نشانی ساتھ لئے جا رہا ہوں"۔

مہرو چونک پڑی۔

"یہ کیا' تم نے ابھی تک اسے سنبھال رکھا ہے!"

"سنبھالتا کیوں نہ مہرو' میں نے اسے کھیل تو سمجھا تھا لیکن زندگی اور پیار کا حقیقی کھیل!" وہ ٹک ٹک ولی خان کو گھورنے لگی۔ بچپن کی یادوں کی ایک سہانی یاد ولی خان نے اسے ابھی تک سنبھال رکھا ہے۔ ولی خان مسکرایا۔

"بس اب تم مجھے ہنستے ہنستے الوداع کہو۔ میں تمہیں ہر لمحے یاد رکھوں گا۔ تم بھی مجھے اپنے دل میں بسائے رکھنا۔"

مہرو روتے رہ گئی' ولی خان چلا گیا۔

پیدل' موٹر' ریل.......... اس نے جگہ جگہ قسمت آزمائی کی۔ محنت مزدوری' نوکری کوئی کام بھی مل جائے' مگر در در کی ٹھوکریں کھانے کے باوجود اسے کوئی سہارا نہ ملا۔ ایک سے دوسرے' دوسرے سے تیسرے شہر.......... وہ بمبئی جا پہنچا۔ دوسرے ملک میں پٹھان ہمیشہ دوسرے پٹھان کے کام آتا ہے۔ بمبئی کی پٹھان برادری نے بمبئی کا کونہ کونہ چھان مارا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک فلم سٹوڈیو میں اسے

دربان کی نوکری مل گئی۔

پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ ایک موٹا ڈنڈا اس کے ہاتھ میں تھما دیا گیا اور اسے کہہ دیا گیا..........

"کوئی غیر آدمی اندر نہ آنے پائے"۔

وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا.......... پچاس روپے!.......... پانچ دس میرا خرچ۔ ہر مہینے چالیس پنتالیس بچ رہیں گے۔ بس چار سال بعد دو ہزار وہ لو۔

اسے کوئی فکر کوئی غم نہیں تھا۔ پوری ایمانداری سے ڈیوٹی بجا لاتا۔ کیا مجال غیر فلمی مچھر بھی اسٹوڈیو میں گھس آئے۔ مالک اس سے بہت خوش تھا۔ ایک سال گزر گیا' اسے محسوس تک نہ ہوا۔ چالیس روپے ہر مہینے بچ جاتے۔ اس کی واسکٹ کی جیب میں چار سو اسی روپے کے نوٹ چنچ رہے تھے۔ وہ ہر شام اپنی کوٹھڑی میں گھس کر انہیں گنتا۔ پھر بڑی احتیاط سے کپڑے کی گتھی میں ڈال کر سیاہ دھاگہ اس پر لپیٹ دیتا۔ پھر اسی واسکٹ کے اندر کی جیب میں ڈال کر اس پر دو تین بار ہاتھ پھیرتا، اطمینان کرتا کہ گتھی ٹھیک سے محفوظ ہو گئی ہے۔

اسے اسٹوڈیو کی ریل پیل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دیکھتا کہ وہاں روز نت نئی لکڑی اور ٹاٹ کی دیواریں بنتی ہیں۔ انہیں روغن کیا جاتا ہے۔ پھر ہفتہ دو ہفتہ بعد انہیں گرا دیا جاتا ہے۔ اسے اس تعمیر اور تخریب پر غصہ آ جاتا۔ کہیں دو سال بعد اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اس تخریب میں لاکھوں کے وارے نیارے ہیں' جب کہیں جا کر اسٹوڈیو کی اہمیت اس پر واضح ہوئی تھی۔

بڑے بڑے سٹار اس سے ہنس ہنس کر بات کرتے۔ کہیں سے یہ بھنک سب سٹاف کے کانوں میں پڑ گئی تھی کہ ولی خان دو ہزار روپے جمع کر کے نوکری چھوڑ دے گا لیکن .... وہ یہ راز کسی کو نہ بتاتا .... مہرو اور ولی خان کے پیار کا مقدس راز .... بتا بھی کیسے سکتا تھا، مہرو کوئی غیر تو تھی نہیں' اپنی ماموں

زاد بہن سے اتنا والہانہ عشق بھلا وہ ہر ایرے غیرے کے سامنے کیونکر کر سکتا تھا............ ایکسٹرا گرل اسے چھیڑتیں۔

"ولی خان شادی کر لو شادی۔ یہی ہنسنے اور کھیلنے کے دن ہیں' پھر تو بوڑھے ہو جاؤ گے!"

ولی خان ہنس کر کہتا۔

"تم لوگ ٹھٹھا کرتا ہے۔ ہم سب سمجھتا ہے لیکن ہم ایسا شادی نہیں کرے گا"۔

وہ ہنس کر چلی جاتیں اور ولی خان سوچنے لگ جاتا............

بے وقوف لڑکیوں' بے جان پتلیو' ولی خان ایسی شادی نہیں کرے گا۔ تم میری منگیتر کو دیکھ لو تو ساری عمر اس کے پاؤں دھونے پر ہی قناعت کر لو۔ تم ہندوستانی لوگوں کے یہ بیمار بیمار جسم' یہ پاؤڈر اور سرخی میں لتھڑے ہوئے چہرے' متلی ہی آ جاتی ہے انسان کو۔ تم ہمارے دیس کی خوبصورتی دیکھ لو تو حیران رہ جاؤ' بھول جاؤ سب کچھ۔

ولی خان کی من کی دنیا ایسی ہی سوچوں سے آباد تھی۔ ایک روز اس نے دیکھا' اس کے ساتھی مرہٹا دربان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس سے نہ رہا گیا۔

"دھنی راؤ کیا بات ہے؟"

دھنی راؤ کے ہاتھ میں لفافہ تھا۔ اس نے ولی خان کی طرف دیکھا۔

"ماں کا خط آیا ہے۔ میری بہن کی عمر پچیس برس ہو گئی ہے۔ ابھی تک اس کی شادی نہیں ہو سکی۔ ایک جگہ بات ٹھہری تھی' وہ بھی ٹوٹ گئی ہے۔ لڑکے والے تین ہزار کا جہیز مانگتے ہیں۔ میں پچاس روپے کا ملازم' ماں بہن کا اور اپنا پیٹ بھروں یا تین ہزار روپے جمع کروں!"

ولی خان نہ صرف دھنی راؤ کا دکھ سن کر آزردہ ہو گیا بلکہ حیران

بھی............ یہ ہندوستان بھی عجیب ملک ہے' لڑکی بھی دو' ساتھ روپیہ بھی دو۔ کتنا الٹا قانون ہے۔ اس نے دھنی راؤ کو بتایا۔

"ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں تو لڑکی والے دو ہزار تین ہزار کا مطالبہ کرتے ہیں اور لڑکے والے گھٹنے ٹیکتے ہیں!"

دھنی راؤ بولا۔

"کاش میں بھی اس ملک میں پیدا ہوتا!"

اور ولی خان کے چٹ پٹے دماغ نے فوراً فیصلہ کر لیا............ تبھی ہندوستان کے ہر شہر میں رنڈی خانہ ہے' چکلہ ہے۔ بے چارے دھنی راؤ کی بہن کب تک شرافت کی چادر اوڑھے رکھے گی۔ کب تک بھائی بہن کا بار اٹھاتا رہے گا۔ کب تک دھنی راؤ کے آنسو اس کا ساتھ دیتے رہیں گے............ اور اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ ہمارے دیس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دو ہزار کے عوض عمر بھر کا ساتھی مل جاتا ہے، کتنا سستا سودا ہے۔ دو ہزار کے عوض انسان! دو ہزار کے عوض مہرو جیسی لڑکی!!

رات کو اس نے نوٹ پھر گنے۔ وہ مسکرا پڑا۔

"مہرو............! آدھا سفر ختم ہو چکا ہے۔ واسکٹ کی جیبوں میں نوٹوں کی تعداد بڑھ رہی ہے' تم چاند گنتی رہو۔ ہر بارہ چاند کے بعد ایک سال۔ چوبیس چاند تو تم گن چکی ہو گی۔ تم خوش نصیب ہو مہرو۔ تم ان پگڈنڈیوں پر روز پھرتی ہو گی' جن پر ہم نے بچپنا گزارہ تھا۔ ان چوٹیوں پر جاتی ہو گی' جہاں سے ہم اپنے ہاتھوں کا بھونپو بنا کر پکارا کرتے تھے۔

"ولی! مہرو!!"

اور ہماری آواز پہاڑوں میں گونجتی' آپس میں الجھتی' ٹکراتی ہوئی واپس ہمارے قدموں میں لوٹ آتی............ "ولی! مہرو!!"

اور ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ ہم دونوں اس بھید کو نہیں پاتے تھے کہ آواز تیرتی گونجتی پھر واپس ہمارے پاس کیوں کر آ جاتی ہے۔ اور پھر بار بار ہم یہ کھیل جاری رکھتے۔ بوجھے سمجھے بغیر اس سے محظوظ ہوتے۔

اور تم کتنی خوش قسمت ہو مہر۔ تم اس چشمے پر بھی روز جاتی ہو گی' جہاں ہم نے کھیل کھیل میں ایک نہ ٹوٹنے والا پیمانِ وفا باندھا تھا۔ تم نے کہا تھا۔

"ولی' میرے ابا تم سے میری شادی نہ کریں تو؟"

اور میں نے کہا تھا۔

"میں تمہاری زلف کاٹ لوں گا!"

تم بولیں۔

"زلف کاٹنے کے لئے شیر کا دل ہونا چاہیے"۔

اور میں نے جھٹ سے چاقو نکال کر تمہاری زلف کاٹ لی تھی۔ تم سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔ تم اپنے بالوں کو ٹٹولنے لگیں۔

"ولی' یہ تم نے کیا کیا۔ یہ تم نے کیا کیا اگر ابا کو پتہ چل گیا تو؟"

"تو کیا............ وہ کہیں گے اپنی منگیتر کو ابھی سے اپنا لیا ہے"۔

لیکن تم مطمئن ہونے کی بجائے ڈری سہمی رہیں............ تمہاری عمر ہی کیا تھی لیکن پھر بھی فطری حجاب اور ابا کے ڈر سے تم کئی روز تک اپنے بال چھپاتی رہی۔

ولی خان مسکرایا۔ اس نے جیب سے وہ چھوٹی سی ڈبیہ نکالی جو آتے وقت وہ مہرو کو کھول کر دکھا گیا تھا۔ ڈبی کھول کر اس کا چہرہ فرطِ مسرت سے جگمگا اٹھا۔

ننھی سی ریشمی بالوں کی مینڈھی۔

وہ ہر رات سونے سے پہلے ڈبیہ کھولتا' زلف نکال کر اسے چومتا۔ کئی کئی بار کسی مقدس مزار کی جھنڈی کی طرح دھیرے دھیرے اپنے چہرے پر پھیرتا اور پھر بڑی عقیدت سے زلف کو ڈبیہ کی گولائی میں سانپ کی کنڈلی کی طرح لپیٹ کر رکھ دیتا۔ اس

معمول میں بالکل ناغہ نہ آتا۔ان کے اس زلف کٹنے کی رسم کا کسی کو علم نہ تھا پھر بھی ان کے دل مطمئن تھے۔ وہ خوش تھے کہ ایک رسم نے ہمیں رواجی اور روحانی طور پر ایک کر دیا ہے۔ حالانکہ قبیلے کے دستور کے مطابق اس رسم کے لئے' وہ عاشق تیار ہوتا ہے جو پہلے تلوار کی دھار کو بوسہ دیدے۔ اس رسم کا ارادہ کرنا ہی بڑے دل گردے کی بات ہوتی ہے۔ یہ ایسا اقدام ہوتا ہے جو موت قبولنے کے بعد کیا جا سکتا ہے۔

اس کے لئے قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی عاشق اپنے محبوب کو زور یا بہ زر یا بہ زاری حاصل نہ کر سکے تو وہ اپنی محبت کو زندہ جاوید بنانے کے لئے اپنی محبوبہ کی زلف برسرِعام یا عموماً ہمجولیوں کے ساتھ پانی بھرتے ہوئے کاٹ لیتا ہے۔ زلف کٹنے کے بعد عام طور پر یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ لڑکی رواجی اور روحانی طور پر اس کی بیوی بن چکی ہے۔ اگرچہ ایسے حالات میں وہ زندگی بھر ملنے نہیں پاتے۔

اس بندھن کے بعد نہ تو لڑکی کے سرپرست اس کی شادی کسی اور جگہ کر سکتے ہیں اور نہ پورے علاقے میں اس بات کی کوئی جرأت کر سکتا ہے کہ اس لڑکی سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے اور نہ ہی لڑکی یہ بات گوارہ کر سکتی ہے کہ جس شخص نے محض اس کی محبت کی اتنی بڑی قیمت ادا کی ہے' وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کی بیوی بن جائے۔

عام حالات میں لڑکی کے سرپرست ایسے شخص کو قتل کئے بغیر نہیں رہتے لیکن اگر حالات کے تحت وہ اسے قتل نہ کر سکیں تو دونوں محبوب اور محبوبہ زندگی بھر شادی نہیں کرتے............ چاہے طالبِ گور وصلِ محبوب سے مایوس و محروم ہی رہیں لیکن اپنے عشق کو لازوال کر جاتے ہیں............

مہرجان سوچتی............ ولی تم سے میرے دو رشتے ہیں۔ ایک خونی ایک روحانی۔ تم میری پھوپھی کے لڑکے بھی ہو' تم میرے منگیتر بھی ہو۔ اب تم نے

ایک تیسرے رشتے کو بھی جنم دے دیا ہے۔ تم نے بچپن کے کھیل کو سنجیدہ صورت دے دی ہے۔ ولی اتنے رشتے ہونے کے باوجود تم مجھے اپنا نہیں سکے۔ تم اس بند کو توڑنے کے لئے کالے کوسوں دور چلے گئے جو ہمارے درمیان حائل کر دیا گیا ہے۔

ولی! دنیا میں کوئی ایسی عورت نہیں' جس کو اس بات سے خوشی نہ ہو' جب وہ اپنے چاہنے والے کو دیکھے کہ وہ اپنی معشوقہ کے لئے تکلیف اٹھا رہا ہے۔

لیکن ولی.......... تم نہ میرے عاشق ہو اور نہ میں تمہاری معشوقہ ہوں۔
پیار و محبت میں عاشق و معشوق سے بھی اگر کوئی قریبی رشتہ ہے تو وہی ہمارا رشتہ ہے۔
ہم ایک گھر میں کھیلے ہیں' ایک گھر میں جوان ہوئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھتے ہیں ، پھر تیرے اور میرے درمیان یہ سودا کیسا۔ یہ دو ہزار کی دیوار کیسی..........؟ تم دور کیوں چلے گئے۔ تم نے صاف صاف کیوں نہ کہہ دیا کہ میں بھی اس گھر کا ایک فرد ہوں۔ میرے ساتھ بھی وہی سلوک کرو جو گھر کے کسی بیٹے سے کیا جا سکتا ہے.......... میں تو برسوں تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔ میں تو ہر نئے ہلال کی راہ دیکھ سکتی ہوں۔ میں تو چشمے کے کنارے شہتوت کے درخت پر سینکڑوں نہیں ہزاروں لکیریں کھینچ کھینچ کر چاند گن سکتی ہوں لیکن ڈرتی ہوں کہیں وقت تمہیں دغا نہ دے جائے۔ بے درد زمانہ مجھے بھینٹ نہ چڑھا دے۔ امیدوں کا گلا کوئی گھونٹ نہ دے۔ مچلتے ارمانوں کی ناؤ کہیں ڈوب نہ جائے؟

لیکن ولی خان کو کوئی غم نہ تھا۔ وہ اپنی دھن سے لَو لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی تمناؤں کی دنیا بڑی حسین تھی۔ اس کے تصور کی دنیا بے حد سہانی تھی.......... بڑی بڑی فلمسٹارز جن کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے دنیا بے تاب رہتی ہے' ولی خان صبح و شام دیکھتا۔ ان سے باتیں کرتا۔ ان کے لئے پھاٹک کھولتا لیکن کیا مجال جو اس کے ذہن میں کوئی پرچھائیں رینگ جائے.......... جب اسے پتہ چلا کہ یہ فلمسٹارز ہزاروں روپے کی تنخواہیں پاتی ہیں' لاکھوں روپے کے کنٹریکٹ پر دستخط کرتی ہیں تو اس

نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"بیوقوف ہیں یہ بمبئی کے رہنے والے' بالکل بدھو ہیں۔!"

پھر اسے ان کی سادگی پر رحم آ جاتا۔ بے چاروں نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے.......... حسن کیا شے ہے' خوبصورتی کیا چیز ہے.......... کاش میرے ارمانوں کی بستی میں کوئی ایک بار جھانک جاتا' پھر انہیں اندازہ ہو سکتا' کون زیادہ امیر ہے اور کون زیادہ دھنوان ہے؟

یہ اونچے محلوں میں سوتے ہیں ، موٹروں میں گھومتے ہیں ، ریشم کی گدیلوں پر آرام کرتے ہیں۔ مرغن غذائیں کھاتے ہیں لیکن.......... اے کاش! کوئی انہیں بتائے' کس کی نیندیں زیادہ آباد ہیں۔ کس کے سپنے زیادہ رنگیلے ہیں۔ کس کی زندگی زیادہ پُرخیال ہے اور کس کے چہرے پر خون کے فوارے پھوٹتے ہیں۔

اے دولت کے متوالو.......... تم کیا جانو' میری پریت کی نگری میں کتنے دیپ جل رہے ہیں۔ میرے پیار کی بستی کتنی روشن ہے!!

پھر اچانک اسے دھنی راؤ کا خیال آ گیا.......... آہ بے چارہ دھنی راؤ۔ مجبور راؤ اور اس کی بے بس و بے کس نوجوان بہن.......... زیادہ پکا پھل جب شاخ سے گرتا ہے تو اس کا رس زمین پر بہنے لگ جاتا ہے' مٹی اور خاک پر۔
واہ ری قسمت.......... بارش کا کوئی قطرہ صدف میں گر کر موتی بن جاتا ہے اور بادشاہوں کے تاج میں جگمگاتا ہے اور وہی قطرہ کسی لق و دق صحرا میں گر کر ہمیشہ کے لئے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

جب وہ رات کی ڈیوٹی پر ہوتا تو جھلمل جھلمل کرتے ہوئے ستاروں سے باتیں کرتا۔ تم میں بھی میرے محبوب کی طرح حسن اور وفا ہے۔ تم بھی روز دکھائی دیتے ہو' مہرو بھی روز دکھائی دیتی ہے۔ تم بھی حسین' مہرو بھی حسین۔ تم بھی دور رہ کر قریب ہو' مہرو بھی دور رہ کر نزدیک ہے.......... تم بھی میری طرح ساری ساری

رات کسی کا انتظار کرتے ہو۔ تم بھی نہیں تھکتے میں بھی نہیں تھکتا۔ تمھاری نگری بھی حسین، میری بستی بھی حسین۔

"اچھا ساتھیو............ اب سو جاؤ، صبح ہونے والی ہے۔ دھنی راؤ آ گیا!"

مہرو کے خیالوں میں بھی ایک چنگاری سلگ اٹھی۔

"ولی تم کہاں ہو............؟ چار برس بیت گئے۔ میں اڑتالیس چاند گن چکی ہوں۔ شہتوت کا تنا لکیروں سے بھر چکا ہے۔ اب آ جاؤ ولی کہ انتظار میں اب سسکنے کا دم باقی نہیں رہا !"

ولی نے ایک کمرے میں دیا جلایا۔ نیلے نیلے نوٹ پوری چارپائی پر بکھر گئے اور دیئے کی مدھم لو میں وہ نوٹ گننے لگا............ ایک ہزار نو سو ساٹھ!"

صرف چالیس روپے کم ہیں۔ وہ مسکرایا............ صرف ایک مہینہ اور۔ پھر میں اپنے دیس جاؤں گا، مہرو تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنانے کے لئے............ نوکری چھوڑ دوں گا۔ سیٹھ سے کہوں گا۔

"سیٹھ جی، یہ لو اپنا ڈنڈا۔ سنبھالو اپنی امانت۔ مجھے اب اپنی امانت کو سنبھالنا ہے"۔

اس نے نوٹوں کی گڈی واسکٹ میں تہہ کر کے سر کے نیچے رکھ دی۔ بتی بجھا کر وہ کھاٹ پر لیٹ گیا۔ اندھیری کوٹھڑی میں خیالوں کے اَن گنت جگنو جگمگانے لگے۔

.... یہ کس کے نرم نرم پیارے پیارے ہاتھ ہیں جو میری روح کو تنہائیوں کی بستی میں لے آتے ہیں اور میرے ساغر میں مسرت کی تلخی اور درد کی مٹھاس انڈیل دیتے ہیں............ یہ کیسی پھڑپھڑاہٹ ہے جس میں فاختائی سنگیت ہے، جو شب کے بے پایاں سکوت میں مجھے ستاروں سے محوِ گفتگو رکھتی ہے............ رات کالی ہے۔ میری نیند اڑ چکی ہے لیکن یہ بے قراری، یہ شب بیداری مسکراہٹوں اور مسرتوں سے بھی زیادہ خوشی کا باعث ہیں............ مہرو! یہ کیا بات ہے، یہ کیا چیز

ہے، جسے ہم محبت کے مقدس نام سے تعبیر کرتے ہیں............؟

مہرو............ میں نے اسی مقدس جذبہ کے تحت لق و دق صحراؤں کو عبور کیا۔ بلند ترین کوہساروں سے گزرا۔ طوفانی موجوں کا مقابلہ کیا............ میں سوچتا ہوں۔ کوئی ایسا بدنصیب بھی ہو گا جو اپنی محبوبہ کی پکار پر اپنے عزیز و اقارب کو............ اپنے مولوف وطن کو خیرباد کہنے کے لئے لبیک نہیں کہتا............

ایک مہینہ گزر گیا۔ ولی خان کے پاس دو ہزار سے کچھ اوپر رقم بن گئی تھی۔ وہ سیدھا سیٹھ کے کمرے میں پہنچا۔ سلام کیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ سیٹھ نے بہتیرا سمجھایا، منع کیا لیکن............ وہ رک بھی کیسے سکتا تھا۔ سیٹھ نے کچھ مزید رقم اسے انعام دی۔

اور اس نے بمبئی سے پشاور تک کا ٹکٹ خرید لیا۔ سرسبز گھاٹیاں، گھنے جنگل، بنجر چٹیل میدان عبور کرتا ہوا اور امنگوں کے ترانے گاتا ہوا وہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

راستے میں گاڑی سٹیشنوں پر کھڑی ہوتی۔ سٹیشن کی چہل پہل اسے بہت پسند تھی لیکن کبھی کبھی اس کا ذہن بری طرح گھُٹ جاتا۔ یہ ہندوستانی لوگ کتنے تنگ ظرف ہوتے ہیں، کسی کو گاڑی میں جگہ تک نہیں دیتے جو کھڑے ہیں، وہ باہر سے آنے والوں کو روکتے ہیں۔ جو بیٹھے ہیں وہ کھڑوں کو بٹھانے پر تیار نہیں اور جو لیٹے ہیں وہ بیٹھوں کے لئے تھوڑی سی گنجائش کے بھی روادار نہیں پھر اندر والوں کی ذہنیت ایک سی ہے باہر سے آنے والوں کے لئے سب کے جذبات ایک جیسے ہیں............ یہ خودغرضی کا سب سے انوکھا فلسفہ ہے۔

وہ سوچتے سوچتے بھنّا جاتا۔ گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگ جاتی۔ خیالات کا دھارا بدل جاتا............ اور وہ دور بے آب و گیاہ پہاڑیوں کے دامن اور چوٹیوں پر پہنچ جاتا............ اس کے سہارے کتنے حسین تھے۔ اس کا الجھا ہوا ذہن کس قدر

جلد صاف اور شفاف ہو جاتا۔ پہاڑی برف کی طرح سفید اور چمکیلا۔

پشاور سے گھر تک تین دن کی پیدل مسافت تھی............ اس نے واسکٹ کے بٹن بند کر دیئے اور چادر کمر سے کس کر روانہ ہو گیا۔ راستے میں کئی بار اس نے افغانی گیتوں کی لے بلند کی۔ وہ بے حد خوش تھا' انتہائی مسرور۔

چلتے چلتے غیر ارادی طور پر مسکرا پڑتا .... مہرو مجھے دیکھ کر چھپ جائے گی اور پھر کہیں آڑ سے چھپ چھپ کر دیکھے گی' شریر کہیں کی............ میری نظریں بھی اسے تلاش کریں گی لیکن وہ کب تک چھپی رہے گی۔

اس کا ہاتھ نوٹوں کی گڈی کو سہلانے لگا۔

بس اب مجھ سے زیادہ انتظار نہ ہو گا، ماموں کو صاف صاف کہہ دوں گا۔

"ہفتے کے اندر اندر بیاہ ہو جائے"............ پھر میں اس سے پوچھوں گا۔

"کس طرح چھپتی تھیں تم"۔

وہ نگاہیں نیچے کر کے کہے گی۔

"بہت ظالم ہو تم۔ چار سال تک تڑپائے رکھا"۔

میں کہوں گا۔

"تم نے یادوں کے سارے خزانے میرے حوالے کر دیئے تھے' کچھ اپنے پاس بھی رکھ لیتی تو اتنا دکھ کاہے کو ہوتا!"

اور ہاں............ ظاہر جان بھی تو اب جوان ہو چکی ہو گی۔ گیارہ سال کی میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ اب پندرہ برس کی ہو گئی ہے............ کتنی شریر تھی بچپن میں۔ مہرو سے کیسے لڑا کرتی تھی اور میری تو کوئی بات نہ مانتی تھی۔ کتنا پٹتی تھی مجھ سے۔ ماموں سے کس طرح چیخ چیخ کر میری اور مہرو کی شکائتیں کرتی۔ ماموں اس کے سامنے اسے خوش کرنے کے لئے ہمیں ڈانٹ دیتے' بعد میں ہم اسے پھر چھیڑنا شروع کر دیتے۔

"ارے............!"

ولی خان اچانک رک گیا............ وہ مسکرایا۔ وہی چشمہ جہاں اس نے مہرو کی زلف کاٹی تھی اور یہ شہتوت کا درخت۔ وہ درخت کی طرف لپکا۔

بے شمار ان گنت لکیریں............ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ایک دو' تین' چار............ اڑتالیس!"

اڑتالیس چاند، وہ ٹھٹکا۔ دو چاند ادھورے ہیں۔ میں نے چار سال دو ماہ گزارے ہیں۔ کل پچاس لکیریں ہونی چاہئیں۔

لیکن ولی خان کچھ اور سوچنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ اس بدشگونی پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے من کی تسلی کے لئے وہ مسکرایا............ بیمار پڑ گئی ہو گی مہرو' غم کھا کھا کر پگلی............! لیکن اب تو اچھی ہو گئی ہو گی۔ خیر میں اسے ٹھیک کر لوں گا اور کہوں گا "جاؤ پہلے چاند پورے کر آؤ۔ اس کے بعد شادی ہو گی!"

کچھ دیر بعد وہ گھر پہنچ گیا............ آہ وہی صحن' وہی دیواریں' وہی ماحول' وہی فضا' سب کچھ وہی ہے۔ سب کچھ وہی ہے............ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"یہ کون ہے؟ یہ کون ہے؟" دونوں کی نگاہیں ملیں۔ وہ اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔

شاید پہچان رہی تھی۔ ولی خان نے اسے پہچان لیا۔ وہ ہنس پڑا۔

"ظارو............! اری تم اتنی بڑی ہو گئی ہو!!"

"ولی بھیا!"

وہ لجا گئی۔ آگے بڑھ کر تعظیماً" اس کے سامنے جھک گئی۔ ولی خان نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"جیتی رہو۔ اچھی تو ہو ظاہر جان"۔

وہ کچھ نہ بولی۔ شرما کر نگاہیں نیچے کر کے ہونٹ چبانے لگی۔ ولی خان نے

پوچھا۔

"ماموں کہاں ہے؟"

"ابھی بلاتی ہوں"۔

وہ بلی کی طرح بھاگ گئی۔ ولی خان نے دائیں بائیں دیکھا............ مہرو کہاں ہے؟ چھپ تو نہ گئی ہو گی۔ مجھے کسی نے آتے ہوئے دیکھا بھی نہیں............ شاید پانی بھرنے گئی ہو مگر چشمے سے تو میں ہو کر آ رہا ہوں............ ہاں ریوڑ لے گئی ہو گی۔ خیر آنے دو شام کو، خوب مزہ رہے گا جب اچانک مجھے دیکھ پائے گی!

سارے گاؤں میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی............

"ولی خان آگیا۔ ولی خان آگیا"۔

ماموں کے ساتھ تو تین چار آدمی اور بھی آ گئے۔ تھوڑی دیر میں سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ سب اسے گلے مل رہے تھے۔ آیا بھی تو چار سال بعد تھا۔ سارا گاؤں اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ولی خان سارا ہندوستان پھر کر آیا ہے، نہ جانے کتنی دولت لایا ہو گا............!

ظاہر جان چولہے کے پاس بیٹھی نظریں چرا چرا کر اسے تک رہی تھی۔ وہ ماموں کو سفر کے حالات بتا رہا تھا۔ شام ہو چکی تھی، تاریکی بڑھ رہی تھی۔ گاؤں والے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ ریوڑ واپس آ چکے تھے۔ اس کی نگاہیں بے تابی سے مہرو کو اِدھر اُدھر ڈھونڈ رہی تھیں۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔

"ماموں............ مہرو نظر نہیں آئی؟"

ماموں بے حد تسلی سے بولا۔

"اس کی شادی ہو گئی ہے بیٹا! دو ماہ ہو گئے ہیں!!"

"شادی............!"

وہ پاگلوں کی طرح چیخا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو ماموں............؟"

"ہاں بیٹا، سچ کہہ رہا ہوں۔ جوان لڑکی، کب تک بیٹھی رہتی۔ سمندر خان نے ڈھائی ہزار نقد کی پیشکش کی۔ کوئی کم رقم نہ تھی، سودا طے ہو گیا۔ آج کل ڈھائی ہزار لینا کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے بیٹا!"

"اوہ ظالم باپ"۔

شدتِ غم سے اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ وہ زار و قطار رو پڑا۔

"تم کتنے ظالم ہو ماموں۔ تم انسان نہیں پتھر ہو پتھر!"۔

مگر ماموں کو تو جیسے اس کی دیوانگی پر حیرت ہوئی ہو۔

"گھبراتے کیوں ہو بیٹا۔ ظاہر جان جوان ہے۔ وہ تمہاری ہی تو امانت ہے!"

آہ............ ماموں نے کیا سوچ کر کیا کر ڈالا ہے۔ شدتِ کرب سے اس نے سر گھٹنوں میں دبا لیا۔ وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ اس نے سنا تھا، مرد کے آنسو کبھی نہیں نکلتے لیکن آج وہ اپنے دکھ اور درد کو ضبط کرنے پر قادر نہ ہو سکا۔ زندگی میں آج پہلی بار اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ بدبختی اور نامرادی کے آنسو............ اسے ایسا لگا جیسے............

یہ دنیا بوچڑ خانہ ہے۔ یہاں بکرے کا گوشت ختم ہو جائے تو کہتے ہیں، دنبے کا گوشت لے جاؤ، گوشت جو کھانا ہے۔ یہاں اپنی لختِ جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے خون اور ہڈیوں سمیت بیچا جاتا ہے اور تول تول کر بیچا جاتا ہے۔ یہاں باپ بیٹی کے بکنے پر فخر کرتا ہے۔

اسے دھنی راؤ یاد آگیا............

"دھنی راؤ، میں نے تم سے کہا تھا، ہمارے دیس میں لڑکیاں بکتی ہیں۔ تم نے کہا تھا، کاش! میں اس ملک میں پیدا ہوتا............ اور دھنی راؤ، میں نے اپنے دیس کی اس رسم پر کتنا فخر کیا تھا۔ آہ! میں کتنا بھولا اور نادان تھا راؤ............

"مجھے اب سمجھ آئی ہے............ وہاں بھی بیٹیاں بکتی ہیں' قیمت دے کر۔ یہاں بھی بیٹیاں بکتی ہیں، قیمت لے کر............ صرف سودوں کے رنگ رُوپ نرالے ہیں۔

"وہاں بھی بیٹی مجبور، یہاں بھی بیٹی مجبور۔ تیرے میرے دیس کی ایک ہی ریت ہے راؤ............ ہندوستان، پاکستان، افغانستان، بلوچستان، وزیرستان یہ سب "تان" ایک جیسے ہیں۔ ان سب تانوں کی تان ایک ہی جگہ ٹوٹتی ہے............!!" اُس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔ ماموں جا چکا تھا۔ ظاہر جان نے اس کے سامنے چارپائی پر روٹی رکھ دی تھی۔ کٹورے میں دودھ اور گھی ملا ہوا تھا اور ظاہر جان سہمی ہوئی پاس کھڑی تھی۔ اس نے ظاہر جان کی طرف دیکھا، رحم بھری نگاہوں سے پھر گھی اور دودھ کے کٹورے کو۔

اور............ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

.... چشمے پر پہنچ کر اس نے واسکٹ کو ٹٹولا۔ نوٹوں کی گڈی باہر نکالی۔ دو ہزار کے نوٹ۔ چار سال دو ماہ کا سرمایہ۔ پچاس چاندوں کی کمائی ہوئی دولت............ اس کی نظریں شہتوت کے تنے پر جا پڑیں۔ تاریک اندھیری رات میں سفید اڑتالیس لکیریں چمک رہی تھیں۔

دو چاند ادھورے تھے!

اس نے جیب سے دیا سلائی نکالی اور پھر آسمان کی طرف دیکھا۔

"ستارو! گواہ رہنا!"

اور دوسرے لمحے ایک سرخ چمکتا ہوا شعلہ بھڑکا اور پلک جھپکنے میں اس کے ارمانوں کی نگری سیاہ راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اس نے سب نوٹ نذرِ آتش کر دیئے تھے۔

اس نے دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنی چھوٹی سی ڈبیہ نکال کر کھولی............ ننھی مُنّی زُلف نے اپنی چھوٹی سی گولائی میں تمام کائنات کو لپیٹ لیا

تھا............ اس نے راکھ کے ڈھیر سے ایک چٹکی بھری اور ڈبیہ میں ڈال دی............ دو آنسو گر پڑے............ ایک زلف میں اٹک کر جگمگانے لگا اور دوسرا سیاہ راکھ میں گر کر جذب ہو گیا!!

سُنہری جال

وہ قانون دان تھا۔ اپنے صوبہ میں ہی نہیں ، پورے ملک میں اس کی قابلیت کی دھاک تھی۔ اس کی نکتہ رسی مسلّمہ تھی۔ کسی سدا بہار درخت کی طرح سے وہ ہمیشہ قسمت کا دھنی رہا۔ پت جھڑ سے اسے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ شاذ و نادر ہی کیس ہارتا۔ دولت اس کے گھر کی لونڈی تھی۔ کامرانی اس کے قدم چومتی تھی۔ شہرت اس کی پیشانی پر بوسے دے رہی تھی۔ ہم پیشہ اس سے حسد کرتے۔ عدالت اس کا احترام کرتی۔ دوست اس پر رشک کرتے۔ رشتہ دار اس پر فخر کرتے اور پبلک اسے سلام کرتی تھی۔ اس نے اپنے پیشہ کی کامیابی کے پیشِ نظر اچھی سے اچھی ملازمت کی پیشکش کو پائے استحقار سے ٹھکرایا۔ پندرہ سولہ سو روپے آزادی سے ماہوار کما لینا کچھ کم خوش نصیبی نہ تھی۔

لیکن آج ملک کا مشہور قانون دان کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا ذہن اینٹھن اور تشنج کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس کے ایک مؤکل ماسٹر نے اس کی ذہنی آسودگی پراگندہ

اور منتشر کر دی تھی۔ اس کے سکون اور مسرت کے سمندر میں تلاطم برپا تھا۔
ماسٹر کے الفاظ کے گہرے کچوکوں سے اس کی روح کی بوٹی بوٹی مجروح ہوتی تھی۔ اس
کے قہقہے ایک غم آلود سنجیدگی میں دب گئے تھے۔

ٹیبل لیمپ کی دلفریب سفید نیلی روشنی میں صاف و شفاف بستر پر پڑا ماضی کے
دھندلکوں میں کھویا ہوا تھا۔ جب اس نے بی۔ اے میں فرسٹ ڈویژن لیا تھا اور
صوبے میں سب سے زیادہ نمبر لے کر نہ صرف اپنا بلکہ کالج کا نام بھی روشن کیا تھا۔
اس خوشی میں اس کے والد نے معززین شہر کو ڈنر دیا تو اس کے مستقبل پر کیا کیا
خیال آرائیاں ہوئی تھیں۔ پرنسپل کا خیال تھا کہ وہ ریاضی میں ایم اے کر کے پروفیسر
بن جائے، ملک کو ایسے ہی ہونہار نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ اس کا والد مذہبی قسم کا
آدمی تھا۔ اس نے ڈاکٹری کو ترجیح دی تھی۔ نیک معاش کے علاوہ اس پیشے سے
غریبوں کے دکھ درد بھی دور کئے جا سکتے تھے۔ اس کے چچا انجینئرنگ کے مداح تھے۔
لیکن یہ سب خوش فہمیاں اکرم محمود کے ایک لطیف اور تفخر آمیز مسکراہٹ سے
ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو گئیں۔ یہ راہیں اس کے منزل سے مختلف سمت کو جاتی
تھیں۔ اس نے اپنی راہ تعین کر لی تھی۔

اس کا خیال تھا، آج بحر و بر پر قانون کا طوطی بولتا ہے۔ سیاست حکومت کی
رانی ہے اور یہ رانی قانون دان کی کنیز ہے۔ سائنسدانش، انجینئر اور ڈاکٹر سب قانون
کے آہنی پنجہ کی گرفت میں ہیں اور یہ آہنی پنجہ قانون دان کا پنجہ ہے۔ آج ہر
براعظم کا سب سے بڑا آدمی قانون دان ہے۔ ہر ملک کا صدر سائنسدان اور وزیر اعظم کوئی
بیرسٹر ہے۔ ہر صوبے کا گورنر اور وزیر اعلیٰ کوئی ایڈووکیٹ ہے۔ ہر ضلع کا ڈپٹی کمشنر
کوئی وکیل ہے۔ تمام جج اور جسٹس قانوندان ہیں۔ زندگی کے ہر اہم شعبہ میں قانون
کی حکومت ہے اور اس کے ذہن پر کئی تصویریں رینگنے لگیں۔ چرچل یورپ کا مرد
آہن، روزویلٹ اور ٹرومین امریکہ کے نا خدا، مسٹر جناح مسلمانوں کا قائداعظم مسٹر گاندھی

ہندوؤں کا باپو اور مہاتما! سب قانون دان ہیں، سب وکیل ہیں۔ قانون نے ہی ان کو یہ
اعزاز بخشا۔ قانون نے ہی ان کو لافانی بنایا اور گردوپیش کی اسی فضا سے متاثر ہو کر اس نے
امتیازی شان کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی سے ایل۔ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی اور پھر
یہ نہیں کہ وہ دوسروں کی طرح کچھوے کی چال چلتا بلکہ اس نے سالوں کی مسافت
مہینوں میں طے کی اور آج چار پانچ سال بعد وہ ملک کا چوٹی کا قانون فہموں میں گنا
جانے لگا۔

لیکن آج اس کا تصور بری طرح الجھ گیا تھا۔ اس کے جذبات کو شدید چوٹ پہنچی تھی۔
نہ جانے بار روم میں وہ ماسٹر سے کس بات پر الجھ گیا۔ اسے اپنی پوزیشن اور احساس
برتری کا گھمنڈ تھا۔ وہ ہر مؤکل کو کوئی تلخ بات کہہ دینا اپنا فطری حق سمجھتا تھا لیکن
یہ ماسٹر لوگ اقبال کو پڑھ کر اپنی گھسی پٹی ذہنیت نہ جانے کیونکر بدل دیتے ہیں۔ غریب
ہونے کے باوجود "ہمالہ" سے ٹکر لے لیتے ہیں طیش میں آکر بولا۔ "آپ کو کس بات
کا گھمنڈ ہے وکیل صاحب! آپ تو مخلوق کی سب سے گری ہوئی ہستی ہیں، جسے جو
بھی چاہے اٹھا کر استعمال کر لے۔ آپ کا مؤکل صرف تیس چالیس روپے میں اور
بعض دفعہ اس سے بھی کم قیمت پر آپ کا ضمیر' آپ کی رائے' آپ کی قابلیت' آپ
کی تعلیم' آپ کا دماغ' آپ کا خلوص' آپ کی چالاکی' آپ کا تجربہ آپ کا رسوخ آپ
کا سب کچھ خرید لیتا ہے اور پھر بکرے کی طرح آپ کو جس مقتل میں اس کا جی چاہے
کان سے پکڑ کر گھسیٹتا پھرتا ہے۔ خود فرشتے کی طرح احترام سے کھڑا ہو جاتا ہے اور
آپ کی زبان مبارک سے اپنے دامن کا داغ دھلواتا ہے۔ بتائیے وکیل صاحب! کیا
اسی عزت و شہرت پر آپ کو فخر ہے؟ کیا اسی عظمت و دولت پر آپکو شان اور ناز
ہے؟" اور وکیل صاحب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ حیرت و استعجاب سے ماسٹر کو دیکھ رہا
تھا۔ اس کی زور دار زبان تالو سے چمٹ گئی تھی۔ خاموشی سے اٹھ کر بار روم کے
ایک گوشے میں دونوں ہاتھوں سے سر تھامے کرسی پر بیٹھا رہا۔ آج وہ کسی مقدمہ میں

بحث نہ کر سکا۔

گھر پہنچ کر بھی سکوت اور اداسی اس پر مسلط رہی۔ بیوی نے وجہ پوچھی تو درد سر کا بہانہ کر کے خاموش ہو گیا۔ کہنی کے سہارے ٹیک لئے وہ بستر پر دراز سوچ رہا تھا۔ حقیر ماسٹر نے کتنی بھیانک اور ذلیل سچائیوں سے پردہ اٹھایا تھا۔ اتنا تجربہ اور علم ہونے کے باوجود یہ باتیں اس کے ذہن میں نہ آئی تھیں۔ ماسٹر نے اس کے سیاہ ریشمی گاؤن پر ہاتھ ڈال کر اسے تار تار کر دیا تھا اور اس کے دامن میں علمیّت عزت اور امتیاز کا جو پھول ٹنکے تھے، انہیں نوچ نوچ کر زمین پر بکھیر دیا تھا۔ وہ گلوں کی نوچی ہوئی پتیوں کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ جن میں رنگ تھا، بو نہ تھی جو مادہ تھا، روح نہ تھی۔ جن میں بوجھ تھا، لطافت نہ تھی۔ اُسکی نظریں فرش پر بچھی ہوئی مخملی قالین پر پڑیں۔ رنگا رنگ کے پھول' سفید' سرخ' نیلے پیلے' پیارے پیارے! لیکن بے روح و بے بو! لطافت سے خالی محض فریب نظر!!

اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ کوئی وجہ جواز مل جائے اور ماسٹر کی باتیں اس کے ذہن سے جذباتی رنگ اتار دیں۔ لیکن ماسٹر نے تو بال کی کھال اتار کر گھناؤنی حقیقت کو اس طرح سامنے رکھ دیا تھا۔ کہ اس کی سالوں کی بنائی ہوئی عظمت میں زلزلہ آ گیا۔ ہزاروں سالوں کے بنے ہوئے مینار گر پڑے اور سینکڑوں کامیابیوں کی بجتی ہوئی گھنٹیاں بند ہو گئیں۔ اس کا تصور ایک عجیب گھٹن کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دماغ ایک انوکھے مواد کو اپنے گوشے میں جگہ دے رہا تھا۔ جو بیزار کن ہونے کے باوجود قابل قبول تھا وہ سوچنے لگا۔ شر' جھگڑے' ہنگامے' خون ریزی' زنا' چوری' ڈاکے' عصمت دری ہی وہ منبع ہے جس سے میری شہرت' ثروت' اور عزت کے چشمے پھوٹے ہیں۔ مری خوش نصیبی کا درخت اسی چشمے سے ہرا بھرا و شاداب ہے۔ اسی شجر کا پھل میری لذیذ غذا ہے۔ اسی غذا کا بنا ہوا خون میرے اور میرے خاندان اسی کی شریانوں میں دوڑ رہا ہے۔ اور یہی خون میری آئندہ نسل کی رگوں میں دوڑے

گا۔ اگر آج ہی کوئی امن کا دیوتا اس چشمہ کا بہاؤ پاتال کی طرف موڑ دے تو یہ سدا بہار درخت سوکھ کر ٹنڈ منڈ ہو جائے گا۔ اس کے چرچراتے ہوئے سوکھے پتے معاشرے کے قدموں تلے آ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ گویا "معاشرے کا فساد ہی میری خوش حالی کا ضامن ہے"؟

اور اس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ اپنے خوبصورت آراستہ اور مزین کمرے کی تمام چیزیں جیسے کاٹنے لگیں۔

بید کی کرسی کی طرح چھلنی زندگی' آبنوس کی خوب صورت چمکتی دمکتی گول میز کی طرح ملمع شدہ زندگی۔ اس کی نگاہیں سامنے لٹکتے ہوئے گباڈین کے سوٹ پر پڑیں جس کی سادگی میں قوس و قزح کے رنگوں کی جھلک کسی مقتول کے خون کا پرتو معلوم دے رہی تھیں، جس کے قاتل کو محض اس لئے سزا نہ مل سکی کہ قاتل اس کا مؤکل تھا اور اس کی دلیلوں میں زور تھا۔ وہ قانون کی ہر لچک سے فائدہ اٹھانا جانتا تھا اور وہ رنگ برنگ کی ٹائیاں! یہ وہ ریشمی پھندے ہیں جنھوں نے تختۂ دار پر اس بے گناہ کی سانسیں چھین لی ہیں جو در حقیقت قاتل نہ تھا لیکن اس کی قانون فہمی نے اسے غاصب' ڈاکو' ظالم اور قاتل قرار دیا۔ اور وہ اونی گرم مفلر! جس پر سیاہ و سفید اودھی دھاریاں ہیں، جیسے چت کبرے سانپ! جو اس کی گردن سے لپٹ جاتا ہے۔ اس کی دھاریاں سچ اور جھوٹ کی دھاریاں ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس کا مؤکل جھوٹا ہے، یہ سیاہ دھاریاں محض اس کے زور بیان سے سفیدی کو چاٹ جاتی ہیں۔

اور یہ خوشنما چمکتی بوٹوں کی قطاریں! اسے محسوس ہوا، کیسی کیسی پاک دامن دوشیزاؤں کی عصمتیں اُن کے تلووں کے نیچے کراہ رہی ہیں۔ غاصب زانی اس لئے کسی اور عصمت کی تاک میں آزادی سے آڑ لئے بیٹھا ہے کہ اس کی جیب میں چند سکے کھنکنا رہے ہیں۔ اور وہ اس دل آویز کھنکناہٹ کے روپہلی نغمے سے ملک کا بہترین قانون دان کا سر اپنے قدموں پر رکھ سکتا ہے اور وہ ناگ جسے چاہے ڈس لے!

حقیقت کو دروغ اور فریب کو سچائی کا روپ دے دینا اس کے پیشے اور فن کی امتیازی خصوصیت ہے۔ وہ اتنا ہی مقبول و سرفراز ہو گا، جس قدر زیادہ وہ گندگیوں اور پستیوں میں رنگ جائے۔ "دوم زمین رنگ ہی میں پنچھی پھنس سکتا ہے!"

اسے گیرج میں اپنی خوبصورت لمبی مچھلی نما کار کا خیال آیا۔ اس کی روح لرز اٹھی۔ جیسے یہ کار نہیں، کسی قاتل کی شیطانی روح ہے جو اسے جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں کی طرف اڑائی چلی جا رہی ہے! بے چینی کراہ رہی تھی۔ اضطرابی کیفیت میں اس کی نظریں الماری اور میز پر پڑی ہوئی موٹی وزنی اور بڑی بڑی کتابوں پر پڑیں۔ خوبصورت جلدیں اور سفید صفحات پر رینگنے والے کروڑوں اربوں سیاہ کیڑوں اور جراثیم کا ایک بحر ظلمات! جنہوں نے اس کی زندگی کی ہر مسرت کو چاٹ لیا تھا۔ جس میں غوطے کھا کھا کر اس کا جسم سدا کا روگی بن گیا ہے۔ میں کولہو کا بیل ہوں۔ صبح سے شام تک چلتا ہوں۔ میری کوئی منزل نہیں ہے۔ فلسفہ آرٹ' ادب' اخلاق' زندگی ہر چیز مجھ سے روٹھی ہوئی ہے۔ سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ سب کو میرے قریب آنے سے گھن آتی ہے اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی زندگی ایک پھوڑا ہے۔ نیلا پھوڑا! ٹیبل لیمپ کی ہلکی نیلی روشنی کی طرح شفاف! جو ایک اناڑی کی ضرب سے پھوٹ پڑا اور جس سے غلاظتوں کے رس بہہ رہے ہیں۔ وہ چیخ اٹھا ہے ....؟ ایسا کیوں ہوا۔ ایسا کیوں ہوا۔ یہ سب کیا ہے؟

وہ سوچتے سوچتے تھک گیا۔ اس نے کروٹ بدلی۔ دوسری طرف دوسرے پلنگ پر اس کی بیوی سو رہی تھی۔ کالی گھٹاؤں میں چاند تیر رہا تھا۔ اس کے خوابیدہ حسن میں بھی انتظار اور دعوت تھی۔ اداس حسن' تھکا تھکا انتظار' مایوس دعوت! عورت اور محبت!! .... اف وہ زندگی سے کتنا دور بہہ گیا تھا۔

وہ روز اسی طرح انتظار کرتے کرتے سو جاتی۔ باتوں کی پیاسی' خلوص کی پیاسی' پیار کی پیاسی' قربت اور لمس کی پیاسی روز اسی طرح سو جاتی۔ اس کی امنگیں

آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھیں۔ اس کے ارمانوں کی وسعتیں سمٹ سمٹ کر محدود ہو رہی تھیں۔ اس کے ولولے سرد پڑ رہے تھے اور اس کی آرزوئیں کراہ رہی تھیں۔ نفسیاتی بھوک سے اس کی نسائیت روگی ہو گئی تھی۔ جسمانی اور روحانی احتیاج نے اسے سڑیل اور خود غرض بنا دیا تھا .... جوانی کی پکار نے دیواروں سے جھانکنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن دیواریں اونچی تھیں .... اور نسائیت کمزور! .... اور وہ ان زنجیروں کی عادی ہو گئی۔ اس نے صبر اور شکست منظور کر لی۔

وہ سوچنے لگا۔ صبح سے دوپہر تک کچہری' بار روم اور عدالت کے چکر! دوپہر سے شام گئے تک پرانے مؤکلوں کو ڈھارس اور نئے آنے والوں سے سودے .... نو دس بجے تک کھانا پینا۔ پھر اگلے روز کے لئے بحث تیار کرنا۔ رات گئے تک ہائی کورٹ فیڈرل کورٹ کے فیصلوں کا مطالعہ .... وہی کولہو کے بیل کا چکر! .... اور میری بیوی!! بیچاری ٹکٹکی باندھے جانے کیا کیا سوچتی ہے .... اور یہ ٹکٹکی اس وقت ٹوٹ جاتی، جب وہ پانی یا چائے مانگتا۔ پانی پی کر وہ تازہ دم ہو جاتا اور وہ پیاسی لوٹ جاتی یا تپائی نزدیک کر کے اس پر چائے کا پیالہ رکھ دیتی۔ صوفے پر بیٹھتی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں ٹھوڑی رکھ کر چائے سے نکلتی ہوئی ہواڑ پر پھر سے ٹکٹکی باندھ دیتی۔ چائے بالکل ٹھنڈی ہو جاتی تو وہ پانی کی طرح ایک سانس میں غڑپ کر کے پی جاتا۔ وہ مضمحل انداز میں اٹھتی۔ چائے کے خالی پیالے کو اٹھاتی۔ شوہر پر نگاہ ڈالتی اور تھکے تھکے بھاری بھاری قدموں سے بے جان لاشے کی طرح بستر پر گر پڑتی۔ سینے میں نفرت و حقارت کی ایک چنگاری سی اٹھتی سلگتی جگر کا خون کھول کر بھاپ بن جاتا۔ باہر نکلنے کے لئے آنکھوں کے آبگینے سے ٹکراتا اور پانی بن کر رخسار پر تیرنے لگتا۔ یہ قطرے بوسوں کی سی لمس پیدا کرتے اور وہ ایک لذت بخش فرحت سے ہم کنار ہو جاتی۔

اسے یاد آیا۔ ریحانہ کو حاصل کرنے کے لئے اس نے کیا کیا پاپڑ بیلے تھے۔

وہ اس کی مؤکل تھی۔ اس کے تنسیخ نکاح کے لئے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔
وہ ایک مقامی سکول میں ہیڈ مسٹرس تھی۔ ان کی پہلی ملاقات سکول کے چندے کے
سلسلے میں ہوئی تھی اور بعد میں یہ اخلاقی اور سماجی ملاقاتیں بڑھتے بڑھتے عشق و محبت
کی منزل تک پہنچ گئیں۔

وہ اس کی مؤکل بنی ۔ تنسیخ نکاح کے لئے اس کے شریف شوہر پر کیا کیا
الزامات عائد نہ کیے گئے تھے۔ پھر ایک روز مؤکل و وکیل شوہر اور بیوی بن گئے۔ کیا
کیا عہد و پیمان ہوئے۔ ہنی مون منائے گئے۔ ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑنے کی
قسمیں اٹھائی گئیں .... زندگی کتنی حسین و دلفریب تھی لیکن .... آج ایک
محسوس انداز میں یہ قسمیں ٹوٹ رہی تھیں۔ مادیت زندگی پر چھا گئی تھی۔ روحانیت
ایک گوشے میں دبک کرسسک رہی تھی۔ ولولے رس بن کر بہہ گئے تھے۔ امیدوں کو
ایک نیا راستہ مل گیا تھا۔ آرزوؤں نے ایک نیا روپ دھار لیا تھا۔ زندگی کی بدلی ہوئی
صورت بہت حسین تھی!

وہ رو پڑا۔ اس کی انکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں کس دلدل میں پھنس
گیا ہوں ؟ میں کتنا ظالم ہوں ، میں کس قدر فریبی ہوں؟

شکست خوردہ نادم لیکن جذبات سے لبریز دل لے کر وہ اٹھا۔ ریحانہ پر جھکا اور
اپنے کپکپاتے ہونٹ اسکی خوبصورت پیشانی پر رکھ دیئے۔ ریحانہ کی آنکھ کھل گئی۔
شوہر کو اس ہیئت میں دیکھ کر اس کا دل سچے پیار کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ مرمریں
باہیں شوہر کے گلے میں حائل کر دیں اور اکرم پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں جا
پڑا۔ محبت کی آغوش کی گرمی محسوس کر کے اس کا دل پھر سے بھر آیا۔ وہ بچوں کی
طرح رونے اور گڑگڑانے لگا۔

”ریحانہ پیاری ریحانہ! مجھے معاف کر دو۔ میں ڈاکو ہوں، میں ظالم ہوں۔
میں تمہارے حسن و شباب اور خلوص کا مجرم ہوں۔ میں نے ان کا خون کیا ہے۔ ان

موٹی موٹی کتابوں نے ان کا خون کیا ہے۔ یہ کتابیں میری ہیں۔ میں ان کو جلا کر راکھ
کر دوں گا، میں .... میں ان کی جگہ ایسی کتابیں لاؤں گا، جن میں پیار و محبت کی
باتیں ہوں۔ عشق و اخلاص کی مثالیں ہوں۔ روح اور روحانیت کا پرچار ہو۔ رنگ اور
بو کی گھاتیں ہوں۔ جذبات و نفسیات کا تلاطم ہو۔ میں وکالت چھوڑ دوں گا۔ میں
ہل چلاؤں گا ـــ میں ہل چلاؤں گا !!“؟

اور ریحانہ کو محسوس ہوا ۔ جیسے اس کے مسرت کا گہوارہ اڑن کھٹولا بن کر
فضاؤں میں تیرنے لگا۔ اس کے یاقوتی لب اکرم کے ہونٹوں سے چپک گئے۔ دونوں کی
زبانیں ہم کنار ہو کر جوانی اور زندگی کا رس چوسنے لگیں۔ رات بھر ہل چلتے رہے۔
تخم ریزی ہوتی رہی۔ کھیتیاں سیراب ہو گئیں۔

لب بہ لب، سینہ بہ سینہ، پنڈلی سے پنڈلی گتھی ہوئی صبح ہو گئی۔ ریحانہ کی
آنکھ کھل گئی۔ اکرم گریبان کھلا سو رہا تھا۔ اُس کی چوڑی چکلی خوبصورت سرخ و سفید
چھاتی ننگی تھی۔ ریحانہ کے لب نین اس کی ننگی چھاتی پر رینگنے لگے۔ میٹھی میٹھی
گدگدی، ہونٹوں کی نرم نرم دبیز گرفت جیسے وہ اندر کی حقیقت چاہتی ہو۔
رات بیتی کی سچائی کا یقین کرنا چاہتی ہو!

خلاف معمول اکرم سویا رہا۔ ریحانہ کی نگاہیں سامنے والی الماری پر پڑیں۔
موٹی موٹی وزنی کتابیں! .... اس نے جھٹ آنکھیں بند کر لیں، کہیں یہ دلفریب
سپنا ٹوٹ نہ جائے !!

اُس کا دل ہولے ہولے دھڑکنے لگا۔ دروازے اور کھڑکیوں کے خوبصورت ریشمی
پردے نسیم سحری سے آہستہ آہستہ لہرا رہے تھے۔ کچن میں نوجوان نوکرانی کا دل اچھل
رہا تھا .... آج بیگم اور صاحب جاگتے ہی نہیں۔ اس نے دبے قدم چوری چوری
ورانڈے کے ساتھ والے روشندان سے جھانک کر کچھ دیکھ لیا تھا۔ وہ صبح سے نہ جانے کئی بار
روشندان تک ہو آئی تھی پھر بھی تمنائے دید تشنہ تھی۔ اس کا دل مچل گیا۔ جوانی

ہوا سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔اس کے جسم میں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں ، کاش ! کاش !! ....

بہت دیر ہو گئی۔ اکرم جیسے سب کچھ بھول گیا تھا۔ ریحانہ کو خیال آیا ، نوکر کیا سوچتے ہوں گے! .... وہ دھیرے سے سرک کر اُٹھ کر آئینہ دیکھا۔اپنے شکن آلود کپڑے دیکھ کر شرما سی گئی۔ "رات کی بات" کی تحریریں مٹائیں۔ آہستہ سے باہر نکلی۔ نوکرانی سے پوچھا۔ "نوری پانی تیار ہے؟"

"جی .... جی .... بی بی جی ! پانی تو دو گھنٹے سے ابل رہا ہے۔" وہ تتلا سی گئی۔ چور کہیں کی، خواہ مخواہ مری جا رہی تھی!۔

ریحانہ بڑے پیار سے اس پر جھک گئی۔اکرم خمار آلود آنکھیں کھول کر بولا۔

"کیا ہے ریحانہ؟"

"اٹھو بھی نو بج رہے ہیں۔ غسل کو لو۔"

"اُوہ ! وہ بولا۔ اور لڑکھڑاتا ہوا غسل خانے پہنچ گیا۔ کپڑے اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیئے۔رشید نے گرم پانی جسم پر ڈالا تو اسے فرحت سی محسوس ہوئی۔ صابن لگا کر جسم ملنے لگا۔ جھاگ آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اسے رات کی بات یاد آ گئی۔

"میں بھی کتنا جذباتی بن گیا تھا۔ بیوی سے کیا کیا کہہ گیا۔ بھلا کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے!" .... اور وہ ہنس پڑا۔ عجیب سی ہنسی !!

پانی کے بھرے بھرے لوٹے جسم پر انڈیلنے لگا۔ جھاگ اور پانی گندی نالی میں سے بہہ رہے تھے!

نہا دھو کر دونوں چائے کی میز پر بیٹھ گئے۔ ہلکے پھلکے‘ خوش خوش‘ پیالیوں سے چائے کی بہترین کوالٹی کی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اکرم کی آنکھوں میں کچھ شرارت کچھ خفت سی ناچ رہی تھی اور ریحانہ کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

چور کی داڑھی میں تنکا!

ریحانہ اس کی کیفیت بھانپ گئی۔ "میں جانتی ہوں۔ تم کیوں مسکرا رہے ہو"۔

"کیا جانتی ہو بھلا"۔ چور کی ڈھٹائی عود کر آئی۔

"یہی کہ کتابوں کو ابھی تک آگ نہیں لگائی جا سکی اور تم ہل نہیں چلا سکو گے۔ اور تم چاہتے ہو کہ ناشتہ کے بعد میں ہنستے مسکراتے تمہیں کچہری جانے کی اجازت دے دوں"۔

"تو پھر کیا سوچا ہے تم نے۔ روٹھ تو نہیں جاؤ گی؟" اکرم نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"روٹھ کر کیا لوں گی اور سوچنے کے لئے تو ابھی زندگی بہت پڑی ہے"۔

"تو پھر؟"

وہ ہنس پڑی۔ بیچارگی کی ہنسی۔ "لگی لگائی روزی کو لات کیوں مار دی جائے اور پھر یہ پیشہ بھی کچھ برا تو نہیں"۔

اور اس نے لپک کر ریحانہ کو آغوش میں لے لیا۔ "تم کتنی اچھی بیوی ہو۔ تم کتنی اچھی مشیر ہو"۔

گباڈین کا سوٹ پہن کر اُس نے آئینہ دیکھا۔ وہ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ خوش رو‘ خوش پوش!

نور جہاں برتن دھو رہی تھی۔ کیتلی سے چائے کے ابلے ہوئے بے روح پتے نالی میں پھینکتے ہوئے اس نے صاحب کو دیکھا۔ وہ کچہری جا رہا تھا ۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔

"کار روز کی طرح گھسی پٹی سڑک پر کچہری کی طرف دوڑنے لگی۔ اکرم سوچ رہا تھا۔ ماسٹر کو کہہ دوں گا۔ یہ لو اپنی رقم ! میں ایسے ذلیل آدمیوں کے مقدمے نہیں لڑا کرتا!!۔

✿✿✿